ڈینئل، ڈیزی اور ڈسپنسر

میں نے یہ کہانی بچا کر رکھی ہوئی تھی کیونکہ یہ اتنی طویل اور اتنی دلچسپ ہے کہ میں اسے کتاب کی صورت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک واردات کی تفتیشی کہانی نہیں بلکہ یہ ایک واردات ہے جرائم کی بھول بھلیوں میں لے گئی تھی جہاں میری اور میرے ساتھی ایک انگریز پولیس انسپکٹر کی جاسوسی اور سراغرسانی والی عقل بھٹک گئی تھی۔ ایسی وارداتوں کی تفتیشی کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی لکھنی چاہئیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ من گھڑت فلمی کہانی ہے لیکن آپ کی فرمائش پر میں اسے ذرا اختصار سے پیش کر رہا ہوں۔

اس واردات کا زمانہ جنگِ عظیم دوم کا تھا۔ جاپان نے برما پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کے بمبار طیارے کلکتہ کی بندرگاہ تک بمباری کر گئے تھے اور نظر کچھ ایسا آتا تھا کہ تمام ہندوستان کے مشرقی حصے یعنی بنگال پر جاپانی فوجیں ضرور قابض ہو جائیں گی۔ جاپان کا جاسوسی کا جال سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ جاپانیوں کی طاقت اور فتوحات کی بنیادی وجہ جاسوسی کے نظام کی اعلیٰ کارکردگی تھی۔ اگر امریکہ انگریزوں کی مدد کو نہ آتا تو آج برِصغیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔

یہ اُس وقت کے حالات تھے۔ ہندوستان کے لوگوں میں بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ دلوں پر انگریزوں کا جو رُعب طاری رہتا تھا وہ کم ہو گیا تھا۔ فوج میں بھرتی ہونے کی وجہ سے، ملک میں کاروبار بڑھ جانے سے، کارخانے اور ٹھیکیداریوں میں بے انداز اضافے کی وجہ سے بیروزگاری ختم ہو گئی اور لوگوں کے گھروں میں روپیہ آ گیا۔ بعض لوگ تو بہت ہی امیر

ہو گئے اور جو غریب تھے وہ خوشحال ہو گئے تھے۔ جرائم میں اضافہ ہو گیا تھا۔ رشوت کا کاروبار بھی چل نکلا تھا۔ قانون شکنی کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔

میں اُن دِنوں دِلّی میں پولیس کی سی آئی اے برانچ میں تھا۔ افسروں میں انگریز زیادہ تھے۔ مجھے یہ سہولت حاصل تھی کہ میں انگریزی روانی سے بول سکتا تھا۔ ایک روز میرے باس انگریز ڈی ایس پی میڈیوز نے مجھے اور ایک انگریز انسپکٹر ٹینیسن کو اپنے دفتر میں بلایا اور ایک کیس کی فائل ہمارے حوالے کر کے کہا کہ یہ فلاں تھانے کا قتل کا کیس ہے اور متعلقہ تھانیدار اس کی تفتیش نہیں کر سکا۔

ڈی ایس پی نے کچھ ہدایات دیں جن میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سب معمول کی باتیں تھیں جو ہمیں زبانی یاد تھیں۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ یہ ہدایات آپ کو بھی سناؤں۔ ایک بات کہنا مناسب ہو گا۔ آج بھی قتل اور ڈاکے وغیرہ جیسی سنگین وارداتوں کے ایسے کیس جن کی تفتیش میں متعلقہ تھانیدار ناکام رہے ہوں، سی آئی اے کے حوالے کئے جاتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کے دَور میں ایسے کیسوں کو جو اہمیت اور توجہ دی جاتی تھی وہ آج نہیں دی جاتی۔ وہ یہ ہے کہ انگریز اپنے قانون کی خلاف ورزی برداشت نہیں کرتے تھے۔ پاکستان میں قانون اُس کا ہے جس کے پاس روپیہ پیسہ ہے۔ یہاں اگر سب سے زیادہ مظلوم چیز کوئی ہے تو وہ ہمارا قانون ہے۔ پاکستان میں سی آئی اے کے پاس صرف وہ کیس جاتے ہیں جن کے پیچھے سفارش یا رشوت کا دباؤ ہو یا حکومت کا کیس ہو۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ انتہائی سنگین وارداتیں تھانوں میں ہی ہضم ہو جاتی ہیں۔ ہمارا ملک تو قانون کا، سزا و جزا کا نیلام گھر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن دیہاڑے بنک لُٹ رہے ہیں، لوگوں کے گھر لُٹ رہے ہیں، جوان لڑکیوں اور بچّوں کو دن کے وقت سڑکوں پر جاتے اُٹھایا اور غائب کیا جا رہا ہے۔ قتل تو ایسے ہوتے ہیں جیسے انسان نہیں مکھیاں ماری جا رہی ہوں۔ ایسا تو انگریزوں کے دَور کی اُن ہندوستانی ریاستوں میں بھی نہیں ہوتا تھا

جن میں مہاراجوں اور نوابوں کا ذاتی قانون چلتا تھا۔ ہم ان ریاستوں کو اندھیر نگری چوپٹ راجہ کہا کرتے تھے لیکن آج پاکستان میں "لا اینڈ آرڈر" کی حالت دیکھ کر وہ ریاستیں پُرامن لگتی ہیں۔ صحیح معنوں میں اندھیر نگری کی تصویر پاکستان پیش کر رہا ہے۔

ہم سوائے دُعا کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ اپنے دَور کے عدل و انصاف اور جُرم و سزا کی کہانیاں سنا سکتے ہیں۔ وہ سُن لیں۔

میں نے آج جو تفتیشی کہانی سنانے کے لئے اپنی ڈائریاں کھولیں اور قلم ہاتھ میں لیا ہے، اس کی ابتدا اُوپر لکھ آیا ہوں کہ ڈی ایس پی نے مجھے اور ایک انگریز انسپکٹر ٹینیسن کو ایک قتل کا کیس دیا۔ متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او کم و بیش بیس دن گزرنے کے بعد بھی تفتیش کو آگے نہیں بڑھا سکا تھا۔

میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے فائل لے لی اور اپنے دفتر میں آ کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ مختصراً قصّہ یوں تھا کہ ایک عیسائی عورت جس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی، ہیضے میں مبتلا ہو کر سرکاری ہسپتال میں داخل کرائی گئی۔ اسے پرائیویٹ روم میں رکھا گیا۔ وہ شادی شدہ تھی۔ ہسپتال میں چوتھی رات وہ کمرے میں بستر پر مُردہ پائی گئی۔ اُس کے خاوند اور سُسر وغیرہ نے اُس کے والدین کو اس طرح اطلاع دی کہ لڑکی ہیضے سے مر گئی ہے۔ خاوند نے لڑکی کی لاش اُس کے والدین کو نہ دی بلکہ اُسے بڑی جلدی دفنانے کا انتظام کر دیا۔

ڈاکٹر نے موت کا سرٹیفکیٹ دے دیا جس میں اُس نے موت کا باعث ہیضہ لکھا۔ لڑکی کے باپ نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی کہ اُس کی بیٹی مری نہیں بلکہ اُسے مارا گیا ہے۔ اُس نے لڑکی کے خاوند پر شک لکھوایا اور کہا کہ لڑکی کو دوائی کے بہانے زہر دیا گیا ہے۔ خاوند پر شک کی وجہ یہ بتائی کہ وہ لڑکی کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا تھا اور اُس کی دوستی ایک ہندو لڑکی کے ساتھ تھی جس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے

اُس نے بیوی کو زہر دے دیا یا دلوایا ہے۔

متعلقہ تھانیدار نے جاکر لاش اپنے قبضے میں کر لی۔ لڑکی کے خاوند اور خاوند کی ماں سے پوچھ گچھ کی تو اُسے شک ہُوا کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور قابلِ تفتیش ہے۔ لاش کے چہرے کے رنگ اور ہونٹوں کے کونوں سے نکلی ہوئی تھوڑی سی جھاگ مصدقہ نشانی اور شہادت تھی کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ تھانیدار نے جو ہندو تھا، لاش پوسٹمارٹم کے لئے بھجوا دی۔ پوسٹمارٹم اسی ہسپتال میں ہوتے تھے جس میں لڑکی مری تھی لیکن اس لاش کا پوسٹمارٹم اس ہسپتال میں نہ کرایا گیا کیونکہ لڑکی کو اُس کے باپ کے الزام کے مطابق اس ہسپتال میں زہر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ الزام اگر صحیح تھا تو اس میں ڈاکٹر یا اس کا کوئی اسسٹنٹ ڈاکٹر ملوث ہو سکتا تھا۔ پوسٹمارٹم انہی ڈاکٹروں نے کرنا تھا۔ وہ غلط رپورٹ دے سکتے تھے۔ اس علاقے کے ڈی ایس پی نے جو انگریز تھا، قتل کے شبہے کی اطلاع ملنے پر تھانیدار کو کہا کہ پوسٹمارٹم سی ایم ایچ (فوجی ہسپتال) میں ہوگا۔

غور کریں کہ قتل کی اطلاع فوراً علاقہ کے ڈی ایس پی کو دی جاتی تھی اور ڈی ایس پی فوراً حرکت میں آجاتے تھے۔ اس کے بعد وہ تھانیداروں کے سر پر سوار رہتے اور تفتیش کی ڈائری باقاعدگی سے دیکھتے تھے۔

سی ایم ایچ میں لاش کا پوسٹمارٹم ہُوا۔ رپورٹ میں لکھا گیا کہ موت زہر سے واقع ہوئی ہے۔ یہ آرسنک یا پوٹاشیم سائنائڈ وغیرہ جیسا زہر نہیں تھا۔ ایسے تقریباً تمام زہروں کے نام مجھے یاد تھے۔ آج بھی یاد ہیں لیکن اس زہر کا نام یاد نہیں رہا۔ لاش کے جگر اور اندرونی دو تین اعضاء کے ٹکڑے ماہرین کے پاس بھیجے گئے تھے۔ لیبارٹری ٹسٹ سے انکشاف ہُوا کہ یہ ایک دوائی ہے جس کے صرف دو تین قطرے دوسری دوائیوں کے مکسچر میں استعمال ہوتے تھے۔ یہی دوائی اگر اکیلی انجکشن کے ذریعے جسم میں داخل کی جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں نے ہسپتال میں اس دوائی کی شیشی دوسری دوائیوں کی بوتلوں میں رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ اس کے لیبل پر لال

حروف میں POISON لکھا ہُوا تھا اور نیچے وارننگ تحریر تھی NOT TO BE INJECTED ——— اس دوائی کے اثرات دوسرے زہروں سے مختلف تھے۔

کیس کی فائل میں یہاں تک معاملہ صاف تھا۔ لڑکی کو زہر دے کر مارا گیا تھا۔ اس سوال کا جواب فائل میں موجود نہیں تھا کہ زہریلی دوائی کا انجکشن کس نے لگایا اور کس کے ایما پر لگایا گیا۔ ہم نے پوری فائل پڑھ ڈالی۔ ان ضمنیوں سے یہی پتہ چلتا تھا کہ متعلقہ تھانیدار نے تفتیش میں محنت نہیں کی۔ اُس کی کوتاہی کی ان دو میں سے ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ وہ نالائق تھا اور بھٹکتا رہا ہے یا اُس نے ملزم سے رشوت لے کر تفتیش کو خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر ایسے ہی ہُوا کرتا تھا اور کوتاہی یا رشوت خوری ثابت ہونے پر متعلقہ تھانیدار کے خلاف محکمانہ یا عدالتی کارروائی ہوتی تھی۔

اس کیس کی فائل پڑھ کر مجھے کوتاہی، کام چوری یا رشوت خوری صاف نظر آرہی تھی۔ تفتیش ایس ایچ او خود کرتا رہا تھا۔ وہ دیوراج نام کا ہندو تھا۔

وائٹ ہارس کی دو بوتلیں

اگلی صبح ہم دونوں متعلقہ تھانے میں گئے۔ سب انسپکٹر دیوراج اُس گھبراہٹ کو چھپا نہ سکا جو اُس پر طاری ہو گئی تھی۔

"مسٹر ملک!" ——— تھانے جاتے ہوئے انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے کہا تھا ——— "تھانے میں جاکر ایس ایچ او کو الگ لے جانا اور اُسے کہنا کہ اُس نے دانستہ گڑبڑ کی ہے تو بتا دے۔ اُسے کہنا کہ ہم پردہ ڈال لیں گے۔ تم میرا مطلب سمجھتے ہو ملک! اگر تم اُس سے اصل بات اگلوا لو تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ یہ ہندوستانی ہے۔ تمہیں اپنا ہندوستانی بھائی سمجھ کر راز

کی بات بتا دے گا۔ میرے متعلق کہنا کہ یہ بڑا بیوقوف اور لالچی انگریز ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں چلے گا، پتہ چل بھی گیا تو اسے وائٹ ہارس وہسکی کی دو بوتلیں دے کر اس کا مُنہ بند کر دیں گے۔"

اس انگریز انسپکٹر کی یہ ہدایت یا تجویز میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ الفاظ کا جادو چلانا ایک قابل پولیس افسر کا خصوصی وصف ہوتا ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ زبان کا جادو چلانے میں استادی حاصل ہو جائے تو لاتوں کے بھوت باتوں سے مانے جاتے ہیں۔

مَیں دیوراج کو الگ لے گیا اور اسے اپنے خاص انداز اور لب و لہجے میں کہا کہ وہ اصل بات بتا دے۔ ٹینیسن کے متعلق وہی باتیں کیں جو اُس نے بتائی تھیں۔ کچھ اضافہ اپنی طرف سے کر لیا۔ یہ بھی کہا کہ یہ انگریز وہسکی کی دو بوتلوں اور دو سو روپوں کی مار ہے۔

دیوراج جس قدر اور جس قسم کی قسمیں کھا سکتا تھا وہ اُس نے کھائیں اور مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُس نے رشوت نہیں لی نہ کسی کی سفارش قبول کی ہے نہ کسی اور لالچ میں ہی آیا ہے۔

میں اُس کے جواب کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ ابھی میں نے اُسے کوئی دھمکی نہیں دی تھی، اُسے لالچ ہی دے رہا تھا۔ دھمکی دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ پولیس افسر تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے خلاف رشوت خوری اور دانستہ کوتاہی کا الزام ثابت ہو گیا تو اُس کا انجام کیا ہو گا۔

"بھائی دیوراج!" — میں نے اُسے کہا — "ہم دونوں نے تمہاری ساری کارگزاری پڑھ لی ہے۔ تم نے انتہائی اہم اشخاص کو شاملِ تفتیش نہیں کیا۔ ان میں ایک اس ہسپتال کا ڈاکٹر انچارج ہے۔ نرس کا بیان بھی شامل نہیں۔"

"میں اس کی وجہ بتاؤں گا" — اُس نے میری پوری بات سُنے بغیر کہا — "میری اس وجہ کو آپ قبول نہیں کریں گے لیکن یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اسے آپ جذباتی کہہ لیں۔ میری بیوقوفی کہہ لیں۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بھی ایسی وجہ کو قبول نہ کرتا۔"

"تم بات کرو دیوراج!" — میں نے کہا — "میں نے تمہیں اپنا ہندوستانی بھائی کہا ہے اور تمہاری غلطی پر پردہ ڈالنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"پھر بھائی بن کر دکھانا ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "کچھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ میرا بچہ بیمار پڑ گیا" — اُس نے بیماری بیان کر کے کہا — "یہ میرا اکلوتا لڑکا ہے، اب اس کی عمر چھ سال ہے۔ ڈاکٹروں کی دوائیاں دیں، کوئی فائدہ نہ ہُوا۔ دو حکیموں کا علاج کرایا۔ فائدہ ہونے کی بجائے بیماری بڑھ گئی۔ بچے کی ہڈیاں رہ گئیں۔ ایک رات تو صاف نظر آنے لگا کہ بچہ صبح کی روشنی نہیں دیکھ سکے گا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ میری بیوی نے کہا کہ بچے کو ہسپتال لے جاؤ اور بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ مَیں نے کہا کہ بچے کو ہسپتال میں داخل تو کر لیں گے لیکن بڑا ڈاکٹر اس وقت بچے کے لئے ہسپتال نہیں آئے گا۔ وہ تو صبح دیکھے گا....

"بیوی بہت روئی۔ کہنے لگی کہ بچے کی زندگی کی صبح نہیں ہو گی۔ مَیں خود یہی سوچ رہا تھا۔ جب دیکھا کہ بچہ آخری سانسوں پر آ گیا ہے تو میں نے بچے کو اُٹھایا اور گھر سے نکل کھڑا ہُوا۔ ایک تانگہ جلدی مل گیا۔ مجھے ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کا گھر معلوم تھا۔ ہسپتال کے ساتھ ہی ہے۔ میں ہسپتال جانے کی بجائے ڈاکٹر کے گھر چلا گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے سوچا تھا کہ ڈاکٹر باہر آیا تو ڈانٹ پلا کر کہہ دے گا کہ اسے ہسپتال لے جاؤ۔ میں منت سماجت کروں گا....

"ملک صاحب! آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ پہلے نوکر باہر آیا۔ میں نے اُسے کہا کہ میرا بچہ مر رہا ہے۔ نوکر نے اور کچھ نہیں سُنا۔ وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر [illegible]۔ میں نے روتے ہوئے اُس کو بچے کی حالت بتائی۔ وہ مجھے اندر لے گیا اور ڈرائنگ روم میں بچے کو صوفے پر لٹا کر دیکھا پھر یہ کہا کہ بچے کو اُٹھاؤ۔ میں نے بچے کو اٹھایا۔ وہ رات کے کپڑوں میں میرے ساتھ چل پڑا۔ اُس نے اوورکوٹ پہن لیا تھا۔ ہسپتال ساتھ ہی تھا۔ راستے میں اُس نے کہا کہ بچے کی حالت تم نے بہت خراب کر دی ہے۔ میں کوشش

کروں گا کہ اس کی جان بچ جاتے ....

"ملک صاحب! اُس نے ہسپتال لے جاکر بچے کو بچانے کی ایسی کوشش کی کہ صبح کر دی اور بچہ سو گیا۔ ڈاکٹر تین بجے کا آیا ہُوا صبح سات بجے گھر گیا اور ساڑھے آٹھ بجے تیار ہو کر پھر ہسپتال میں آگیا۔ وہ میرے بچے کو دیکھنے کے لئے آیا اور ایک انجکشن لگا کر چلا گیا۔ دو دنوں میں اس نے میرے بچے کو ٹھیک کر دیا۔ بخار اور پسلیوں کا دَرد ختم ہو گیا۔ پانچویں روز اُس نے بچے کو ہسپتال سے فارغ کر دیا۔ بچہ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔"

"ڈاکٹر تمہیں جانتا ہو گا" — میں نے کہا — "تم اسی علاقے کے تھانے کے انچارج ہو۔"

"بالکل نہیں" — دیوراج نے جواب دیا — "اس کے ساتھ میری کبھی ملاقات نہیں ہُوئی تھی۔ اُس نے دو تین روز بعد مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا کام کرتے ہو۔ اُس نے مجھے ایک عام شہری سمجھا تھا اور انسانی ہمدردی کے خیال سے جاگ کر میرے بچے کا علاج کیا تھا .... میں اس کا احسان ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔ میرا بچہ بچ گیا اور میرا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہُوا۔ اب اس ہسپتال میں یہ واردات ہو گئی تو میں نے تفتیش شروع کی۔ اس ڈاکٹر نے مجھے الگ بٹھا کر کہا کہ ہسپتال میں ایسی واردات کبھی نہیں ہوئی۔ اب ایک واردات ہو گئی ہے اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس میں ہسپتال کا کوئی ملازم شامل نہیں۔ تم ایک مہربانی کرو کہ تفتیش کو ہسپتال سے باہر رکھنا ورنہ اس میں ہسپتال کی بدنامی ہو گی اور میری بھی بدنامی ہو گی ....

"ملک صاحب! میں اس ڈاکٹر کا اتنا احسان مند تھا کہ میں نے ہسپتال کے عملے کے کسی آدمی کو بھی شاملِ تفتیش نہ کیا۔ ہسپتال میں ایک لیڈی ڈاکٹر اور ایک ڈاکٹر اور ہے۔ یہ اسسٹنٹ ڈاکٹر اور بڑا ڈاکٹر بھی مقتولہ کے کمرے میں آیا کرتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھ گچھ کی تھی

لیکن انہیں شاملِ تفتیش نہیں کیا۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ مجھے کوتاہی کا ملزم بنا دیں، چاہیں تو مجھ پر رشوت خوری کی دفعہ لگا دیں لیکن جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔"

"کیا تم کیس گول کرنا چاہتے تھے؟" — میں نے پوچھا — "تمہارا ارادہ کیا تھا؟"

"میرا شک مقتولہ کے خاوند پر ہے" — اُس نے کہا — "میں اُس کے خلاف شہادت ڈھونڈ رہا تھا۔ قتل کا باعث معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ میں تو کیچڑ میں پھنسا ہُوا تھا۔ یہ بات صاف ہے کہ مقتولہ کو ہسپتال کے کسی ملازم کے ہاتھوں زہر دلوایا گیا ہو گا۔ آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی ہے۔ ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ زہر مُنہ کے راستے نہیں دیا گیا، انجکشن کے ذریعے دیا گیا ہے۔"

جہاں تک جذبات کا تعلق تھا، میں سب انسپکٹر دیوراج کی ذہنی اور جذباتی حالت کو سمجھتا تھا۔ اگر اُس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ڈاکٹر کے اتنے بڑے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے یہی خطرہ مول لیتا جو دیوراج نے لیا تھا۔ اُس نے اپنی نوکری خطرے میں ڈال دی تھی لیکن واردات کی سنگینی اور ایک پولیس افسر کی ڈیوٹی کا مطالبہ کچھ اور تھا۔ قانون کچھ اور کہتا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی اور انسپکٹر ٹینیسن کو یہ ساری بات سنا دی۔

"کیا تم اُس کے اس جرم کو نظر انداز کرنا چاہتے ہو؟" — ٹینیسن نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں انسپکٹر صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "ابھی میں اس کے اس جرم کو نظر انداز کرنا چاہتا ہوں۔ اگر دورانِ تفتیش ایسی شہادت مِلی کہ اس سب انسپکٹر نے کوئی شہادت چھپانے کی کوشش کی ہے اور کسی سراغ پر پردہ ڈالا ہے تو پھر میں اسے نہیں بخشوں گا۔"

"اسے یہی بتاتے رہو کہ اس کے خلاف ہم کوئی کارروائی نہیں کریں گے" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "اس طرح یہ ہمارے ساتھ پورا پورا

تعاون کرے گا۔"

میں نے دیوراج کو تسلی دی اور کہا کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے۔

ایئر ہیڈ کوارٹر کی سمارٹ سٹینو

چونکہ مقتولہ کے باپ اور بڑے بھائی نے تھانے میں رپورٹ دی تھی کہ مقتولہ کو مارا گیا ہے اور ایف آئی آر انہی کے نام سے تحریر ہوئی تھی اس لئے ہم نے سب سے پہلے ان دونوں کو طلب کیا۔ پہلے باپ کا بیان لیا۔ مقتولہ کی عمر پچیس چھبیس سال تھی اس لئے میں اُسے لڑکی لکھ رہا ہوں۔ اُس کا نام ڈیزی تھا۔ باپ سے پوچھا کہ اُسے یہ شک کیوں ہُوا تھا کہ اُس کی بیٹی اس بیماری سے نہیں مری بلکہ اُسے مارا گیا ہے۔

"خاوند اسے بہت تنگ کرتا تھا" — باپ نے جواب دیا — "چند مرتبہ خاوند نے میری بیٹی کو مارا پیٹا بھی تھا۔"

"کیا یہ زبردستی کی شادی تھی؟" — میں نے پوچھا اور کہا — "آپ کے ہاں تو لڑکی لڑکا اپنی پسند کی شادی کیا کرتے ہیں۔"

"جی ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "یہ شادی ان کی اپنی پسند کی تھی، بلکہ لڑکے کی پسند زیادہ تھی۔ یہ صحیح معنوں میں لَو میرج تھی۔ لڑکے پر کسی طرح کی بھی زبردستی نہیں کی گئی تھی۔"

"اب بتائیں کہ ان میں ناچاقی کس طرح شروع ہُوئی؟"

"ڈیزی نے ایک سال کے اندر اندر یہ شکایت شروع کر دی کہ اُس کا خاوند اس سے کھچا کھچا رہنے لگا ہے" — مقتولہ کے باپ نے کہا —

"اس کے بعد اس کے خاوند کا رویہ دن بدن خراب ہوتا چلا گیا۔ میری بیٹی اس کے متعلق جو باتیں بتاتی تھی ان سے یہی پتہ چلتا تھا کہ وہ میری بیٹی سے جان چھڑانا چاہتا ہے اور اس کا دھیان کسی اور لڑکی کی طرف ہو چکا ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیٹی کا دھیان کسی اور طرف ہو گیا ہو" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "بہتر یہ ہو گا کہ صحیح جواب دینا۔ تمہاری بیٹی جیسی بھی تھی، مر گئی ہے۔ ہماری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمارے دل سے تمہاری اور تمہارے خاندان کی عزت نکل نہیں جائے گی۔ میں بھی تمہاری طرح کرسچین ہوں۔ ہمارا طرزِ بود و باش کچھ اور طرح کا ہے۔"

"اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو ڈینیل مجھ سے ضرور شکایت کرتا" — مقتولہ کے باپ نے جواب دیا۔ ڈینیل اس کی بیٹی کے خاوند کا نام تھا۔ اُس نے کہا — "میں نے اور میرے بیٹے نے ڈینیل سے کئی بار پوچھا تھا کہ اُسے ڈیزی کے خلاف کیا شکایت ہے۔ اُس نے ہر بار ہمارے ساتھ بدتمیزی کی لیکن کوئی شکایت نہ کی۔"

انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ انڈین کرسچن اپنے آپ کو پورا انگریز سمجھتے ہیں۔ اس کا انہیں یہ نقصان ہُوا ہے کہ اپنے انڈین کلچر سے جو ان کا اپنا کلچر ہے ہٹ گئے ہیں اور انگریزوں کے کلچر کو اپنا کلچر سمجھتے ہیں مگر ہم لوگ یعنی انگریز انہیں قبول نہیں کرتے۔ انسپکٹر ٹینیسن نے یہ بھی کہا تھا کہ انگریزوں نے انڈیا میں آ کر ان غریب لوگوں کو عیسائی بنا لیا۔ یہ بیچارے محنت مزدوری اور لوگوں کے گھروں میں گھٹیا سی نوکری اور صفائی کرنے والے لوگ تھے۔ پادریوں نے عیسائیت کے فروغ کے لئے انہیں اپنے مذہب میں شامل تو کر لیا لیکن بجائے اس کے کہ انہیں مذہب کے متعلق کچھ بتاتے، انہیں سبز باغ دکھاتے اور ان کے دماغوں میں یہ ڈالا کہ تم ہندوستان کے بادشاہ ہو۔

"چاہیئے تو یہ تھا کہ ان کے لئے باعزت ذریعۂ معاش تلاش کیا جاتا" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "لیکن ان میں انگریزوں والی عادتیں پیدا کر دی گئیں۔ یہ لوگ انگریزوں کی طرح شراب پینے لگے۔ حقے کی بجائے سگریٹ، سگار اور پائپ پینے لگے۔ ان کی عورتیں سکرٹ اور فراک پہننے لگیں۔ اس طرح یہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ اس کیس میں بھی تمہیں یہی کچھ نظر آئے گا۔"

میں اس انگریز کی یہ باتیں خاموشی سے سُنتا رہا تھا۔ میرے لئے یہ باتیں نئی نہیں تھیں۔ اُس نے جو رائے دی تھی وہ بالکل صحیح تھی۔ وہ ابتدائی انڈین کرسچن اپنی اصلیت کو بھول کر اخلاقی تباہی میں جا پڑے تھے اور اس پر وہ فخر کرتے تھے۔ انگریزوں کی موجودگی انہیں اور زیادہ خراب کرتی تھی لیکن انگریز انہیں صرف اتنی سی اہمیت دیتے تھے کہ یہ کرسچن ہیں ہم لوگوں کو تو انڈین کرسچن اپنا غلام سمجھتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر یہ تجربہ ہُوا تھا کہ چھوٹے سے عہدے کا کوئی کرسچن تھانے میں آجاتا تو وہ حاکموں کی طرح بات کرتا اور یہ الفاظ ضرور کہتا تھا کہ میں کرسچن ہوں۔ انگریزوں کا ایک کلچر تھا جس میں کچھ پابندیاں بھی تھیں اور کچھ اصول تھے لیکن ہندوستانی عیسائیوں نے یہ سمجھ لیا کہ مادر پدر آزاد ہو جانے کو انگریز ہو جانا کہتے ہیں۔

یہاں میں اپنے پاکستانی عیسائیوں سے معذرت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ پیشِ نظر رکھیں کہ میں اُس دَور کے ہندوستانی عیسائیوں کی بات کر رہا ہوں۔ میں اس سے زیادہ بُری باتیں اپنی قوم کے متعلق بھی کیا کرتا ہوں۔ پاکستان کی عیسائی برادری اُن ہندوستانی عیسائیوں سے بہت مختلف اور صحیح معنوں میں بلند کردار ہے جن کا میں اس کہانی میں ذکر کر رہا ہوں۔ پاکستان کے عیسائی ایک باعزت اور باوقار کمیونٹی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو انگریز نہیں بلکہ پاکستانی سمجھتے ہیں۔ پاکستان کی مسلح افواج میں ہمارے مسیحی بھائیوں کے کارنامے پاکستان کی تاریخ کا قابلِ قدر بلکہ قابلِ فخر حصّہ ہیں۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ میں آج سے سالہا سال پہلے کے انڈین عیسائیوں کے متعلق کوئی الٹی سیدھی بات لکھ دوں تو پاکستانی عیسائی اپنی ہتک نہ سمجھیں۔

انسپکٹر ٹینیسن نے انڈین کرسچن کمیونٹی کے متعلق رائے دی تھی۔ میں نے اپنی رائے دی ہے لیکن مقتولہ کے باپ، اس کے بعد اُس کے بھائی اور پھر اُس کی ماں سے پوچھ گچھ اور گفتگو ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ خاندان اپنے آپ کو انگریز نہیں بلکہ ہندوستانی سمجھتا ہے اور انہوں نے اپنے

ہندوستانی کلچر کو نہیں چھوڑا سوائے اس کے کہ آزاد خیال کے لوگ تھے۔ اس سے زیادہ آزاد خیال بلکہ اخلاقی پابندیوں سے بھی آزاد میں نے کئی مسلمان دیکھے تھے۔ مقتولہ کے خاندان نے اپنے وقار کو قائم رکھا ہُوا تھا۔

مقتولہ کے باپ سے کم و بیش اڑھائی گھنٹے کی جو تفتیش اور گفتگو ہوئی وہ مختصراً یوں ہے کہ مقتولہ ایئر ہیڈ کوارٹر میں ایک ڈائریکٹوریٹ میں سٹینو تھی اور وہ بڑی سمارٹ، خوبصورت اور گریجویٹ تھی۔ اُس کا خاوند جی ایچ کیو میں کسی اچھے عہدے پر ملازم تھا۔ ان کی شادی ہوئے تین سال ہو گئے تھے اور ابھی ان کا ایک بھی بچہ نہیں ہُوا تھا۔ یہ بعد میں مقتولہ کی ماں سے پتہ چلا تھا کہ وہ فیملی پلاننگ کرتے تھے۔ مقتولہ خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ اسی گھر میں مقتولہ کا سُسرال خاندان بھی رہتا تھا۔

مقتولہ کے باپ نے بتایا کہ مقتولہ کی ساس بھی اُس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی۔

"یہ کوئی ایسی وجہ نہیں جو قتل کا باعث بن جاتی" — میں نے کہا — "آپ جانتے ہیں قتل انتہائی سنگین جُرم ہے۔ انسان قتل اُس وقت کرتا ہے جب وہ حالات سے مجبور ہو کر پاگل ہو جاتا ہے یا آپ یوں کہیں کہ ڈینیئل ذہنی طور پر نارمل نہیں یا آپ کی بیٹی نے اُس کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جنہوں نے اسے ذہنی طور پر ابنارمل کر دیا تھا۔"

"میرے گھر والے بعض باتوں سے مجھے بے خبر رکھتے ہیں" — مقتولہ کے باپ نے کہا — "میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ میری بیٹی نے نہیں بلکہ کسی اور لڑکی نے ڈینیئل کو نارمل نہیں رہنے دیا۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ ہم لوگ طلاق نہیں دے سکتے۔ صرف موت میاں بیوی کو جدا کر سکتی ہے۔ ڈینیئل کے پاس میری بیٹی سے آزاد ہونے کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ اُسے قتل کر دیتا جو اُس نے کر دیا۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ میں نے تھانے میں رپورٹ لکھوائی تھی کہ میری بیٹی بیماری سے نہیں مری بلکہ اُسے مارا گیا ہے۔ میری رپورٹ پوسٹمارٹم نے سچی ثابت کر دی۔ اب یہ معلوم کرنا آپ کا کام

ہے کہ میری بیٹی کو زہر کس نے دیا ہے۔ میرا یہ شک ڈینیل پر ہے۔ انسپکٹر دیوراج نے تفتیش میں دلچسپی نہیں لی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس نے ڈینیل سے یا جو کوئی بھی قاتل ہے، اس سے رشوت لی ہے یا بہت بڑی سفارش چل گئی ہے۔ میں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا اور کیس سی آئی اے کو بھجوا دیا۔"

"آپ نے اثر و رسوخ کو کہاں چلایا تھا؟"

"ایئر ہیڈ کوارٹر میں" — اُس نے جواب دیا — "وہ جس انگریز گروپ کیپٹن کی سٹینو تھی، میں نے اُسے کہا تھا اور اُس نے کیس سی آئی اے کو دلوانے کا انتظام کیا تھا۔"

"کیا کبھی ڈینیل نے آپ کی بیٹی کو کہا تھا کہ وہ سروس چھوڑ دے؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"شاید نہیں" — مقتولہ کے باپ نے جواب دیا — "میری بیٹی نے کبھی مجھے بتایا نہیں تھا .... مجھے شک اس لئے بھی ہُوا تھا کہ ڈینیل کی طرف سے اطلاع آئی کہ ڈیزی ہیضے سے مر گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے اطلاع دی کہ تین گھنٹے بعد میری بیٹی کو دفن کیا جا رہا ہے۔ میں حیران ہُوا کہ ان لوگوں کو دفنانے کی کیا جلدی پڑ گئی ہے۔ میں اپنے ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق اپنی بیٹی کی لاش کو اپنے گھر لانا چاہتا تھا اور جن لوگوں کے ساتھ وہ ایئر ہیڈ کوارٹر میں کام کرتی تھی، انہیں بھی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ اپنے کئی رشتہ داروں کو بھی بلانا تھا۔ میں اور میری بیوی فوراً ڈینیل کے گھر گئے اور انہیں کہا کہ میں اپنی بیٹی کی لاش کو اپنے گھر لے جاؤں گا اور میں جب چاہوں گا اسے دفن کروں گا۔ اس کے جواب میں ڈینیل اور اس کی ماں نے میری بے عزتی کر دی۔"

"کیا انہوں نے گالیاں والیاں دی تھیں؟" — میں نے پوچھا۔

"گالیاں تو نہیں دی تھیں" — اُس نے جواب دیا — "اُن کا جواب ہتک آمیز تھا۔ ڈینیل کی ماں نے کہا کہ تم لوگوں نے اپنی بیٹی کی زندگی میں

بھی ہمیں پریشان رکھا ہے اور اُس کے مرنے کے بعد بھی ہمیں پریشان کر رہے ہو۔ ڈینیل نے کہا کہ ڈیزی کی بیماری ایسی تھی کہ اس کی لاش کو جلدی دفن کرنا ضروری ہے ورنہ لاش خراب ہو جائے گی۔"

"کیا آپ نے اپنی بیٹی کی لاش دیکھی تھی؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"دیکھی تھی" — اُس نے جواب دیا — "لاش کا چہرہ دیکھ کر میرا شک پختہ ہو گیا کہ لڑکی بیماری سے نہیں مری۔ چہرے کا رنگ بدلا ہُوا تھا۔ لڑکی کا رنگ زندگی میں اتنا صاف تھا کہ اسے سفیدی مائل کہہ سکتے تھے۔ گالوں کا رنگ ذرا گلابی بھی ہوتا تھا۔ مرنے کے بعد یہ رنگ اور سفید ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن چہرہ ذرا ذرا نیلا ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا رنگ زہر کے اثرات سے ہوتا ہے .... میرا خیال ہے کہ میرے بیٹے کو زیادہ باتوں کا علم ہے۔ میں جو کچھ جانتا تھا وہ سب آپ کو بتا دیا ہے۔"

مسلمان ٹھیکیدار بھی آن ٹپکا

میں خود محسوس کر رہا تھا کہ یہ شخص کچھ چھپا رہا ہے یا اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ ہم نے اس کے بڑے بیٹے کو بلایا۔ وہ مقتولہ سے تین چار سال بڑا اور شادی شدہ تھا۔ ایک بنک میں وہ افسر تھا اور اپنے طور پر ایک انشورنس کمپنی کا ایجنٹ تھا۔ اُس کے متعلق فوراً اندازہ ہو گیا کہ خود اعتمادی سے بات کرنے والا اور عقل والا آدمی ہے۔

"تمہارا باپ کہتا ہے کہ تم اُس کی نسبت زیادہ باتیں جانتے ہو" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا — "کیا یہ صحیح ہے؟"

"بالکل صحیح ہے" — اُس نے جواب دیا — "کچھ باتیں ایسی ہیں جو ہم نے ابھی تک انہیں نہیں بتائیں۔ بیچارے بوڑھے آدمی ہیں ہم انہیں کوئی صدمہ نہیں دینا چاہتے لیکن خدا نے انہیں ایسا صدمہ دیا جو ہمارے بس سے باہر ہو گیا تھا۔"

"تمہاری مقتول بہن اور اس کے خاوند کے متعلق وہ کون سی باتیں ہیں جو تم نے اپنے باپ سے چھپائی ہوتی تھیں؟" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں میرے باپ نے آپ کو کیا کچھ بتایا ہے" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "میں نے اپنے باپ سے ایک بات یہ چھپائی ہوتی تھی کہ ڈینیل ڈیزی کو کیوں تنگ کرتا تھا۔ اس بدبخت نے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ دوستی لگائی ہوئی ہے۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ بی اے پاس ہے اور سوشل ہے۔ اس کا باپ جے پال کانگرس کا بڑا لیڈر تو نہیں لیکن کانگرس کا اہم کل پرزہ ہے۔ روپے پیسے والا آدمی ہے۔ لڑکی کا نام وجنتی ہے۔ باپ کے ساتھ سیاسی کام کرتی ہے۔ اسے سوشل ورکر بھی کہہ سکتے ہیں پولیٹیکل ورکر بھی۔ خوبصورت لڑکی ہے۔ رنگ گورا ہے اور تیز طرار لڑکی ہے۔ اس میں ہندوؤں والی گھٹن نہیں۔ اس نے بال کٹواتے ہوتے ہیں۔ ساڑھی پہنے یا شلوار قمیض، اس کا جسم اتنا پُرکشش ہے کہ اس کے لباس کی طرف آپ دیکھیں گے ہی نہیں۔"

"مسٹر فرانسس!" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے ہنس کر کہا ـــــ "وجنتی کا حُسن بیان کر کے تم مجھے اشتعال دلا رہے ہو کہ میں اس لڑکی کو دیکھوں اور اس کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری بہن کے قتل کی باتیں ہو رہی ہیں ورنہ میں تمہارے بیان کے اِس حصّے سے بہت لُطف اُٹھاتا .... ہاں تم کہہ رہے تھے کہ تم نے یہ بات اپنے باپ سے چھپائی ہوتی تھی۔"

فرانسس نے دو تین اور باتیں بتائیں جو وہ سمجھتا تھا کہ اُس کے باپ کو معلوم نہیں لیکن ان میں سے ایک دو باتیں اس کے باپ نے ہمیں بتائی تھیں۔

"کیا تمہیں بھی شک تھا کہ تمہاری بہن کو زہر دیا گیا ہے؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "اگر تھا تو یہ شک کس طرح پیدا ہُوا؟"

"میں نے کئی بار شام کے بعد ڈینیل کا پیچھا کیا" ـــــ اُس نے جواب دیا

ـــــ "وجنتی کہیں نہ کہیں انتظار میں ہوتی تھی۔ عام طور پر یہ دونوں کینٹ پیلس میں ملتے اور کسی ہوٹل میں جا بیٹھتے تھے۔ میں نے انہیں پکچر ہاؤس میں بھی دیکھا ہے۔ راتوں کو تنہا جگہوں کی طرف جاتے ہوتے بھی دیکھا ہے۔ ان کی دوستی واپسی کی حد سے آگے نکل گئی تھی۔"

"دوستی کب شروع ہوئی تھی؟"

"ایک سال سے!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "میرا اندازہ یہی ہے۔ آپ نے پوچھا تھا کہ مجھے کیوں شک ہُوا کہ ڈیزی کو زہر دیا گیا ہے۔ میرے باپ نے لاش کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ میں پہنچا تو تابوت بند ہو چکا تھا۔ پولیس نے آکر تابوت کھلوایا تھا۔ میں اس سے پہلے ہسپتال چلا گیا تھا۔ وہاں سے لاش ڈینیل کے گھر جا چکی تھی۔ ہسپتال میں جوزی نام کی ایک نرس ہے جو میری بیوی کی دوست ہے۔ وہ مل گئی۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے ڈیزی کی موت کی اطلاع ملی ہے اور میں یہاں آگیا ہوں ....

"جوزی نے بتایا کہ لاش جا چکی ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ گذشتہ شام وہ ڈیزی کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ خاصی صحت یاب ہو چکی تھی۔ اس کی حالت مرنے والی نہیں تھی۔ صبح پتہ چلا کہ وہ مر گئی ہے۔ اس نرس کی ڈیوٹی جنرل وارڈ میں ہوتی ہے۔ اسے بھی معلوم تھا کہ ڈیزی کے ساتھ خاوند کی نا چاقی ہے بلکہ ان کی آپس میں بول چال بھی بند ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ ایسے لگتا ہے جیسے ڈیزی کو کوئی غلط دوائی دے دی گئی ہے .... دانستہ یا غلطی سے! ....

"میں نے کہا کہ دانستہ غلط دوائی دی گئی ہے۔ پوسٹمارٹم رپورٹ نے تصدیق کر دی۔ میں نے بعد میں لیبارٹری رپورٹ بھی دیکھی تھی۔ اس میں اس زہریلی دوائی کا نام بھی لکھا تھا۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ زہر ڈینیل نے خود دیا یا دلوایا ہے۔"

"تم بہن کو دیکھنے ہسپتال جاتے رہتے ہو گے" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "تمہارا کیا خیال ہے، ڈیزی بہتر ہو رہی تھی؟"

"میں باقاعدگی سے ہر روز صبح آفس جانے سے پہلے ڈیزی کو دیکھنے جاتا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "آخری دن بھی گیا تھا اور میں بڑے ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر سے بھی ملا تھا۔ دونوں نے کہا تھا کہ سیدھا سادا ہیضہ ہے جو ختم ہو گیا ہے۔ اب اس کے اثرات باقی ہیں جو دو دنوں میں ختم ہو جائیں گے لیکن اُسی رات وہ مر گئی۔"

"کیا تم ڈاکٹر سے نہیں ملے تھے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ "اور اُس سے پوچھا نہیں تھا کہ ڈیزی صحت یاب ہوتے ہوتے مر کس طرح گئی ہے؟"

"میں بڑے ڈاکٹر سے ملا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "اُس نے میڈیکل اصطلاحوں میں جواب دیا تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کے پاس کوئی جواب نہیں اور وہ خود حیران ہے کہ یہ کیا ہُوا ہے۔"

"تم نے اپنے باپ سے اور کیا بات چھپاتی ہوتی تھی؟"۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"یہ ایک الزام تھا جو ڈینیئل نے میری بہن پر لگا رکھا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "ایک مسلمان ملٹری کنٹریکٹر ہے۔ اُس کا ایک جوان بیٹا عمران علی اُس کے ساتھ کام کرتا ہے۔ ڈینیئل کہتا ہے کہ ڈیزی نے عمران علی کے ساتھ دوستی لگا رکھی ہے اور ابھی اُس سے ملتی ملاتی ہے۔"

"کیا یہ الزام صحیح تھا یا غلط؟"۔۔۔ میں نے پوچھا اور اسے کہا ۔۔۔ "ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہاری بہن چال چلن کے لحاظ سے اچھی تھی یا بُری۔ ہم نے قاتل کو پکڑنا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں زیادہ سے زیادہ معلومات کی ضرورت ہے۔ تم خود بھی یہی چاہتے ہو گے۔"

"میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میں سمجھتا ہوں کہ آپ یہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ قتل کی وجہ کیا ہو سکتی ہے .... ڈینیئل کا یہ الزام غلط نہیں تھا لیکن معاملہ اتنا سنگین نہیں تھا جتنا اُس نے بنا رکھا تھا۔ اُسے تو ایک بہانے کی ضرورت تھی جو

اُسے مل گیا تھا۔ وہ تو ڈیزی سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ ڈیزی اور عمران کی آپس میں دوستی ہو گئی تھی۔ ڈیزی ایئر ہیڈ کوارٹر میں تھی اور عمران کے پاس ایئر فورس کا کوئی ٹھیکہ تھا۔ وہ ایئر ہیڈ کوارٹر میں آتا جاتا رہتا تھا اس طرح ان کی آپس میں دوستی چل نکلی۔ ڈیزی کی میرے ساتھ بہت ہی بے تکلفی تھی۔ ایک روز اُس نے مجھے بتایا کہ عمران علی اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ صرف یہ فیصلہ کرنا باقی ہے کہ دونوں میں سے کون اپنا مذہب چھوڑ دے۔ ڈیزی کی باتوں سے میں نے یہ تاثر لیا کہ وہ عمران کی محبت میں اس حد تک گرفتار ہو چکی ہے کہ یہ اپنا مذہب چھوڑ دے گی۔ میں نے اُسے سختی سے منع کیا۔ اس کے فوراً بعد عمران کی کہیں منگنی ہو گئی اور پھر اُس کی شادی بھی ہو گئی۔ ادھر ڈینیئل اور ڈیزی کی ملاقات ہوتی اور انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ڈیزی کے متعلق میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ وہ اپنا بھلا بُرا اپنی عقل سے سمجھ سکتی تھی۔ کوئی فیصلہ جذبات کے اثر سے نہیں کرتی تھی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ عمران کی شادی ہو گئی ہے تو اپنے اُوپر غم اور افسوس طاری کرنے کی بجائے اُس نے ڈینیئل کے ساتھ شادی کر لی۔"

"کیا تم ڈینیئل کو اچھی طرح جانتے تھے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ "کیا تم اسے شریف آدمی سمجھتے تھے؟"

"ہماری اپنی کمیونٹی کا آدمی تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میں اُسے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ شریف آدمی تو نہیں تھا۔ اچھا خاصا چالاک اور اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ خوش طبع اور ملنسار بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں اُس کی زبان کی خوشگواری سے متاثر ہو گیا تھا اور اُسے اپنی بہن کے لئے موزوں آدمی سمجھا تھا۔"

"کیا ڈیزی شادی کے بعد بھی عمران سے ملتی تھی؟"۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"ڈینیئل نے پہلے یہ الزام کبھی نہیں لگایا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب

دیا ـــــ "تقریباً ایک سال پہلے جب اُس نے ڈیزی کے ساتھ اپنا رویہ تلخ اور تکلیف دِہ کر لیا تو اُس نے یہ الزام لگانا شروع کر دیا کہ ڈیزی عمران سے ملتی ہے اور اس کے دل میں ابھی تک عمران کی محبت موجود ہے۔ میں نے ڈیزی سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ عمران کے ساتھ اُس کی ایسی ملاقات نہیں ہوتی جیسی ڈینیل کہتا ہے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ عمران کبھی کبھی اپنے کسی کام یا اپنی ٹھیکیداری کے سلسلے میں ایئر ہیڈ کوارٹر میں آتا ہے تو اُس کے ساتھ ہیلو ہیلو ہو جاتی ہے .... میں جب ڈینیل سے کہتا تھا کہ اُس نے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ تعلقات قائم کر رکھے ہیں تو وہ لڑنے پر اُتر آتا تھا۔"

"تم یہ تسلیم کرنا پسند نہیں کرو گے کہ تمہاری بہن کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا!" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا۔

"میں اُس کی جگہ کیسے قسم کھا سکتا ہوں؟" ـــــ اُس نے دانشمندانہ جواب دیا ـــــ "وہ سروس کرتی تھی۔ سوسائٹی میں اُٹھتی بیٹھتی اور گھومتی پھرتی تھی۔ میں یا گھر کا کوئی آدمی اُس کے ساتھ ایسکارٹ کی طرح نہیں رہتا تھا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ میری بہن کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا تو اُس کے قتل کی یہی وجہ ہو سکتی ہے اور قاتل ڈینیل ہی ہے لیکن میری رائے یہی ہے کہ ڈینیل نے وجنتی کے ساتھ شادی کرنے کی خاطر میری بہن سے اس طرح نجات پائی ہے کہ اُسے زہر کا انجکشن لگوا دیا ہے۔ میں نے آپ کو یقین دلانے کی کوشش نہیں کی کہ ڈیزی عمران سے نہیں ملتی تھی۔ یہ دو وجوہات ہیں جو قتل کا باعث بنی ہیں۔ ان میں سے جو باعث بھی تھا، قاتل ڈینیل ہی ہے۔"

اس شخص سے جو تفتیش اور تحقیقات ہوئی، اس میں بھی کم و بیش اڑھائی گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ میں نے اس کے ضروری حصے آپ کو سناتے ہیں۔ میں نے آپ کو پہلے بھی اپنی کہانیوں میں بتایا ہے کہ ہر فرد سے جو پوچھ گچھ اور تفتیش کی جاتی ہے وہ پوری کی پوری لکھنے لگوں تو ہر

تفتیشی کہانی کم از کم پانچ سو صفحات پر پھیل جاتی۔ مقتولہ کے اس بھائی سے ہم نے چھوٹی چھوٹی بے شمار باتیں دریافت کی تھیں۔ اُس کا یقین یہی تھا کہ قاتل ڈینیل ہے۔ شک تو ہمیں بھی یہی تھا لیکن اس شک کو یقین میں بدلنے کے لئے ہمیں قابلِ یقین شہادت کی ضرورت تھی۔ مقتولہ کے لواحقین کے بیانات کو ہم قابلِ یقین نہیں سمجھ سکتے تھے کیونکہ وہ مظلوم پارٹی تھی جسے انگریزی میں AGGRIEVED پارٹی کہتے ہیں۔

ہم نے مقتولہ کے اس بھائی کو یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ وہ شہر سے باہر نہ جائے کیونکہ کسی بھی وقت ہمیں اُس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اُسے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے طور پر بھی سراغرسانی کرتا رہے۔

چوکور کے چار کونے

میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے کچھ دیر آپس میں تبادلۂ خیالات کیا۔

ہمیں سب سے پہلے اس ہسپتال کے ڈاکٹر انچارج، لیڈی ڈاکٹر، اسسٹنٹ ڈاکٹر، اُس نرس اور اُن ملازموں سے پوچھ گچھ کرنی چاہیئے تھی جو مریضہ کی دیکھ بھال کے لئے اُس کے کمرے میں آتے جاتے تھے لیکن ہم نے یہ طے کیا کہ پہلے اِردگرد سے کچھ شہادت تلاش کر لی جائے۔ ہر اُس فرد کے متعلق کچھ نہ کچھ جاننا ضروری ہوتا ہے جس کا تعلق واردات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔

قتل کا شک عمران پر بھی ہو سکتا تھا اور وجنتی پر بھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ مقتولہ نے عمران کو دھوکہ دیا ہو، اُس سے مال کھاتی یا بٹورتی رہی ہو پھر اُس نے ڈینیل کے ساتھ شادی کر لی۔ عمران اگر کسی ملٹری کنٹریکٹر کا بیٹا تھا تو یقیناً مالدار آسامی تھا۔ اُس پر اس لئے بھی شک کیا جا سکتا تھا کہ وہ مسلمان تھا۔ مسلمان میں یہ وصف ہمیشہ رہا ہے کہ اُس کے پاس دولت آجاتے تو وہ سب سے پہلے عورت کی طرف توجہ دیتا ہے پھر وہ قانون کو اپنی ملکیت

سمجھتا ہے۔ پھر وہ عورت کی خاطر قتل کرنے یا کروانے پر اُتر آتا ہے۔ پکڑا جاتا ہے تو پولیس کو رشوت کھلاتا ہے اور دولت مقدمے میں اُڑاتا ہے۔

وجنتی پر بھی شک کی بڑی نمایاں وجہ ملتی تھی۔ ہم نے یہ دیکھنا تھا کہ وہ کس حد تک ڈینیل کی محبت میں گرفتار تھی۔ اگر یہ محبت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوتی تھی تو یہ ہو سکتا تھا کہ اُس نے اپنے اثر و رسوخ سے مقتولہ کو زہر کا انجکشن لگوا دیا ہو۔ قاتل جو کوئی بھی تھا اُس کے لئے یہ موقع بڑا اچھا تھا۔ مقتولہ ہسپتال کے ایک کمرے میں بیکار پڑی تھی۔ ہسپتال کے کسی بھی ملازم یا نرس کو کچھ رقم دے کر مریضہ کو زہر کا انجکشن دلوایا جا سکتا تھا۔

یہ خاص طور پر پیشِ نظر رکھیں کہ مقتولہ کو مسلسل گلوکوز لگا رہا تھا۔ گلوکوز کی نالی میں بڑی آسانی سے زہر انجیکٹ کیا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ آج کل گلوکوز کے پلاسٹک کے بیگ ملتے ہیں اور وہی سٹینڈ کے ساتھ لٹکا دیتے جاتے ہیں لیکن اُس وقت شیشے کا ایک بڑا کپ سا ہوا کرتا تھا جس میں گلوکوز ڈال کر اسے ایک خاص قسم کے سٹینڈ پر فٹ کر دیا جاتا تھا۔ اس کے نیچے سوتی والی نالی لگی ہوتی تھی جس سے گلوکوز مریض کی رگ میں داخل ہوتا رہتا تھا۔

میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ جب پتہ چلا کہ مریضہ مر چکی ہے تو اُس وقت بھی اُسے گلوکوز لگا ہُوا تھا۔ مقتولہ کے مر جانے کی وجہ سے اُس کی رگوں میں خون رُک گیا تھا اس لئے گلوکوز بھی رُکا ہُوا تھا۔ بچا ہُوا گلوکوز ایگزامینر کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اُس نے رپورٹ لکھی تھی کہ گلوکوز بالکل صاف پایا گیا ہے اور اس میں کوئی زہریلی آمیزش نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زہریلی دوائی نالی میں انجیکٹ کی گئی تھی۔ اُس وقت یہ نالیاں جو آج پلاسٹک کی ہیں ربڑ کی ہُوا کرتی تھیں۔ ساری زہریلی دوائی نالی سے نکل کر گلوکوز کے ساتھ مقتولہ کے جسم میں چلی گئی تھی۔

ہم نے عمران علی اور وجنتی کے ایڈریس معلوم کئے۔ پہلے عمران کو

طلب کیا۔ اُس کے آنے تک مقتولہ کے خاوند ڈینیل کو بلا لیا۔ وہ اُنتیس تیس سال عمر کا خوبرو آدمی تھا۔ چہرے، چال ڈھال اور جسم کی ساخت سے سے پھرتیلا اور ذہین لگتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ میری بجائے انسپکٹر ٹینیسن کی طرف زیادہ توجہ دیتا تھا۔ مجھے وہ اپنی ہندوستانی رعایا کا ایک ادنیٰ فرد سمجھتا تھا۔ شاید اپنا نوکر بھی سمجھتا ہو۔ ہم تفتیش انگریزی زبان میں کر رہے تھے۔ انسپکٹر ٹینیسن اُردو بولتا اور سمجھتا تھا۔ ہندوستان کی پولیس کے انگریز اُردو بولتے تھے۔ اس سے انہیں سہولت رہتی تھی اور اُردو دانی ان کی ترقی کا باعث بھی بنتی تھی۔

انسپکٹر ٹینیس اُردو بولتا اور سمجھتا تھا لیکن اس کیس میں ہم یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اُردو نہیں جانتا۔ ڈینیل کو میرے متعلق معلوم نہیں کیوں غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میں انگریزی نہیں جانتا۔ اُس سے سب سے پہلے سوال ٹینیسن نے ہی کئے اور میں خاموش بیٹھا رہا۔ میں شکل و صورت سے تو جاہل اور اَن پڑھ نہیں لگتا تھا، شاید میرا چُپ بیٹھے رہنا میری جہالت ظاہر کرتا تھا۔

"مسٹر ڈینیل!" — انسپکٹر ٹینیسن نے اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں کر کے اُسے کہا — "یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیوی زہر سے مری ہے۔ اُسے زہر دیا گیا تھا۔ شاید یہ انجکشن کے ذریعے دیا گیا تھا۔ اگر میں تم پر الزام عائد کروں کہ یہ کام تم نے کیا ہے کہ تم کیا کہو گے؟"

"میں انکار کروں گا" — اُس نے کہا۔

"پھر اُسے زہر کس نے دیا؟" — ٹینیسن نے پوچھا — "کیوں دیا؟ کسی کے ساتھ تمہاری یا تمہاری بیوی کی دشمنی تھی؟"

"ایسی دشمنی تو کسی کے ساتھ نہیں تھی کہ وہ ایسا انتہائی اقدام کرتا" — اُس نے کہا — "میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ اُسے زہر کس نے دیا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہسپتال کے ڈسپنسر یا نرس نے غلط انجکشن لگا دیا ہو۔"

"مسٹر ڈینیئل!" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "ہم پوسٹمارٹم رپورٹ اور لیبارٹری رپورٹیں دیکھ چکے ہیں۔ دوائی جو مقتولہ کو انجکشن کے ذریعے دی گئی تھی وہ کوئی ڈاکٹر نہیں لکھا کرتا۔ اس کے دو تین قطرے پکچر میں ڈالے جاتے ہیں .... یہ بھی سُن لو مسٹر ڈینیئل! ہم بہت ساری شہادت حاصل کر کے تمہارے ساتھ بات کر رہے ہیں۔ اس کیس کے معاملے میں میرا ذہن کوری سلیٹ نہیں۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تم غلط بیانی سے پہلے دو چار مرتبہ سوچ لینا۔"

"مجھے ڈر ہے کہ آپ کے ذہن کی سلیٹ پر غلط باتیں لکھ دی گئی ہیں" — اُس نے کہا — "میری بیوی کے والدین اور بھائی نے آپ کو گمراہ کر دیا ہے۔ اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں اُسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ میری بیوی کو غلط دوائی دی گئی تھی۔"

"کیا تم نے تھانے میں رپورٹ دی تھی کہ ڈاکٹروں یا ہسپتال کے عملے کی غفلت سے تمہاری بیوی مر گئی ہے؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا — "یا تم نے کوئی اور کارروائی کی تھی؟ ڈاکٹر انچارج سے شکایت کی تھی؟"

"نہیں!" — اُس نے جواب دیا۔ وہ خاصا گھبرا گیا تھا۔ دو چار سیکنڈ سوچ کر بولا — "مجھے بیوی کے مرنے کا اتنا صدمہ تھا کہ میں کچھ سوچ ہی نہ سکا۔"

"قتل کی وجوہات موجود ہیں" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "ایک چوکور ہے۔ اس کے اندر قتل کا باعث موجود ہے .... تم ہو۔ تمہاری بیوی ہے، ایک ہندو لڑکی وجنتی ہے اور ایک مسلمان عمران علی ہے۔ یہ اس چوکور کے چار کونے ہیں۔ تمہیں ابھی کچھ ایسی شہادت کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے متعلق تم سمجھتے ہو گے کہ ہمیں معلوم نہیں۔"

وہ بے چین سا ہو گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ابھی تک ایک لفظ نہیں بولا تھا۔

"کیا اِس انڈین کو یہاں بٹھانا ضروری ہے؟" — اُس نے انسپکٹر ٹینیسن سے میرے متعلق کہا — "اس کی موجودگی سے میں UNEASY محسوس کر رہا ہوں۔ ہم اور آپ تو ایک مذہب اور ایک قوم کے آدمی ہیں۔ یہ تو انگریزی بھی نہیں سمجھتا۔ مَیں صرف آپ کے ساتھ بات کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔"

ٹینیسن مُسکرایا۔ یہ باتیں انگریزی میں ہو رہی تھیں۔

"مسٹر ملک!" — انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے انگریزی میں کہا — "بہتر ہے کہ تم بھی کچھ بولو" — اُس نے ڈینیئل سے جھوٹ بولا — "مَیں نے اِس انڈین انسپکٹر کو اس لئے ساتھ رکھا ہے کہ مَیں اُردو نہیں جانتا۔"

"مسٹر ڈینیئل!" — مَیں نے انگریزی میں کہا — "میں اپنی اِس بدنصیبی پر شرمسار ہوں کہ میں تمہاری اور انسپکٹر ٹینیسن کی قوم کا فرد نہیں ہوں اور تمہاری بدنصیبی یہ ہے کہ تم مشتبہ ہو۔ ہم تم پر قتل کا الزام عائد کر رہے ہیں۔ تم اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرو۔"

"اوہ!" — وہ گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں اُردو میں بولا — "مَیں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ میں دراصل اِس گورے کو پھونک دے رہا تھا۔ میں آپ کو کہنا چاہتا تھا کہ مَیں اور آپ ایک ہیں۔ ہم ہندوستانی ہیں۔ دیکھیں یہ مجھ پر کیا الزام تھوپ رہا ہے۔ آپ نے بھی اسی کے کہنے پر وہی الزام دُہرا دیا ہے۔ یہ گورے ہمیں جنگلی اور پسماندہ سمجھتے ہیں۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔"

انسپکٹر ٹینیسن یوں خاموش بیٹھا تھا جیسے اُس کے پلے کچھ بھی نہ پڑ رہا ہو۔ ڈینیئل کی اِس دوغلی زبان سے اُس کے خلاف شک مزید پختہ ہو گیا۔

دلکش امانت

چونکہ یہ شخص نمبر ایک مشتبہ تھا اس لئے اس پر ہم نے سب سے زیادہ وقت صَرف کیا۔ میں اس کا بیان اپنے الفاظ میں سناؤں گا۔ اُس نے

تسلیم نہ کیا کہ وہ مقتولہ کے ساتھ بدسلوکی کرتا تھا اور اُس نے کبھی اُس کی پٹائی کی تھی۔ اُس نے دجنتی کے ساتھ دوستی تسلیم کر لی لیکن یہ نہ مانا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس دوستی کو وہ محض میل ملاقات کہتا تھا۔

"اپنی بیوی سے مجھے ایک شکایت ضرور تھی" — اُس نے کہا — "وہ ایک مسلمان سے محبت کرتی تھی اور اُس نے اس مسلمان کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ یہ شادی نہ ہو سکی۔ اس مسلمان کا نام عمران ہے۔ میں نے سُنا تھا کہ اُس کے والدین کو پتہ چل گیا کہ یہ ایک عیسائی لڑکی کے ساتھ شادی کر رہا ہے تو اُنہوں نے اس کی شادی ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ کر دی۔ ڈیزی کو بہت رنج ہُوا۔ ہماری کمیونٹی کے بڑوں نے مجھے کہا کہ مَیں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لگا لوں اور اس کے ساتھ شادی کر لُوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کسی اور مسلمان کو پسند کر لے۔ میں نے یہ کام کیا اور اس سے شادی کر لی۔"

"کرسچین کمیونٹی کے مجبور کرنے پر" — مَیں نے کہا — "ویسے یہ لُو میرج نہیں تھی۔ تم نے اپنے دل سے مجبور ہو کر اِس لڑکی کو پسند نہیں کیا تھا۔"

"اگر تمہیں کمیونٹی کے بڑے نہ کہتے تو تم شادی کسی اور کے ساتھ کرتے" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا۔

"نہیں!" — ڈینیل نے جواب دیا — "مجھے یہ لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ مر گئی ہے ورنہ وہ بتاتی کہ اِس مسلمان کے ساتھ وہ گھومتی پھرتی تھی تو بھی مَیں اسے کئی بار ملا اور محبت کا اظہار کیا تھا۔ اُس نے مجھے دھتکارا نہیں تھا بلکہ بڑے اچھے طریقے سے مجھے بتایا تھا کہ وہ عمران کو چاہتی ہے۔"

"شادی ہو گئی" — مَیں نے پوچھا — "پھر ناچاقی کس طرح شروع ہوتی تھی؟"

"کوئی ناچاقی نہیں تھی" — اُس نے جواب دیا — "اگر تھی تو یہ

ناچاقی اتنی شدید نہیں تھی کہ میں اُسے قتل کروا دیتا۔"

"تم اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے کہ تمہاری بیوی عمران سے شادی کے بعد بھی ملتی تھی" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "عمران آ رہا ہے۔ وہ تمہارے سامنے کہے گا کہ ڈیزی اُسے ملتی تھی اور تم اُسے منع کرتے تھے۔ ہم تک یہ شہادت پہنچ چکی ہے کہ تمہاری اپنی بیوی کے ساتھ اسی بات پر ناچاقی تھی جو بڑی ہی شدید تھی۔"

مَیں نے اور ٹینیسن نے مل کر اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کی تو اُس نے تسلیم کر لیا کہ ڈیزی عمران سے ملتی تھی۔

"کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو مسٹر ڈینیل!" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "مَیں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ ہم نے بہت سی شہادت حاصل کر کے تمہیں بلایا ہے۔"

"مَیں نے یہ بات چھپانے کی کوشش اس لئے کی تھی کہ یہ نہایت معمولی بات تھی" — ڈینیل نے کہا — "دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں کہ مَیں نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے اور آپ قتل کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے ڈیزی کو اِس وجہ سے قتل کیا ہے کہ وہ عمران کو چاہتی اور اُسے ملتی تھی .... حقیقت یہ ہے کہ وہ اُسے کبھی کبھار ملتی تھی۔ مَیں یہ برداشت بھی کر سکتا تھا لیکن ان کا اتنا سا ملنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔"

ہمارے تفصیلی سوالوں اور اُس کے تفصیلی جوابوں سے بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ میں مختصراً سناتا ہوں۔ اُس نے خود ہی کہہ دیا کہ وہ اِس کوشش میں ہے کہ وہ کسی بھی سوال کا ایسا جواب نہ دے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ ہے قتل کی وجہ۔ وہ بیوقوف آدمی تھا۔

اُس سے مقتولہ کی بیماری کے متعلق پوچھا تو اُس نے کہا کہ اُسے اپنی بیوی سے محبت نہ ہوتی تو اُسے ہسپتال میں داخل نہ کراتا۔ گھر میں پڑی رہنے دیتا۔ معمولی سی دوائیاں لے دیتا اور چند دنوں بعد وہ مر جاتی۔

اُس نے بتایا کہ جونہی اُسے اُلٹیاں شروع ہوئیں وہ اُسے ہسپتال لے گیا اور پرائیویٹ کمرے میں رکھا۔

"میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ کوئی دوائی ہسپتال میں نہ ہو تو مجھے فوراً بتائے" ——— اُس نے کہا ——— "میں سارے انڈیا میں گھوم کر وہ دوائی لے آؤں گا۔ میں کسی نوکرانی کو اُس کی دیکھ بھال کے لئے اُس کے کمرے میں رکھ سکتا تھا لیکن میری ماں اُس کے ساتھ رہی اور مَیں دن رات کئی کئی بار اُسے دیکھنے جاتا تھا۔"

"مرتے وقت اُس کے پاس کون تھا؟" ——— انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"میری ماں موجود تھی" ——— اُس نے جواب دیا۔

"کیا تمہاری ماں نے ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ مریضہ مر رہی ہے یا اس کی حالت بگڑ گئی ہے؟" ——— مَیں نے پوچھا۔

"اس کا جواب تو میری ماں دے سکتی ہے" ——— اُس نے جواب دیا ——— "میں ابھی تک صدمے سے اتنا نڈھال ہوں کہ یہ پوچھا ہی نہیں کہ آخری وقت ڈاکٹر کو بلایا گیا تھا یا نہیں۔"

"تمہیں موت کی اطلاع کتنے بجے ملی تھی؟" ——— میں نے پوچھا ——— "اور یہ اطلاع کس نے دی تھی؟"

"صبح کے تین بج رہے تھے" ——— اُس نے جواب دیا ——— "میرے پڑوس میں ایک ریٹائرڈ کرنل رہتا ہے۔ اُس کے فون پر مجھے اطلاع ملی تھی۔ اطلاع دینے والی میری ماں تھی۔"

اتنی طویل تفتیش نے اُس کی حالت ایسی کر دی تھی کہ اُس کے ہونٹ خشک اور آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ اُس نے اس دوران تین چار مرتبہ پانی پیا تھا۔ اُسے ہم نے گھر نہ جانے دیا۔ سی آئی اے کے ہیڈکوارٹر کے ایک کمرے میں بٹھا دیا اور اُسے بتایا کہ سارے کیس کی تفتیش ختم ہونے تک اُسے یہیں رہنا پڑے گا۔

یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ ہم نے تھانے کے مخبروں کو اپنے

ماتحت لے لیا اور انہیں اپنی ہدایات دے کر مصروف کر دیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے جب ہم نے ڈینیل کو فارغ کیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ عمران اور وجنتی آتے ہوتے ہیں۔ مَیں باہر نکلا تو ایک معزز قسم کا ہندو میرے پاس آیا۔ میں اُسے معزز اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ ہندوؤں کے مخصوص لباس میں نہیں بلکہ کوٹ پتلون میں ملبوس تھا اور اُس نے ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک اور ہندو تھا۔ وہ اُونچی کلاس کے ہندوؤں کے لباس میں تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وجنتی کو کیوں طلب کیا گیا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ ایک کرسچن عورت قتل ہو گئی ہے۔ اُس کی تفتیش میں وجنتی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ وجنتی ملزمہ یا مشتبہ نہیں۔ اس سے ایک دو معلومات لینی ہیں اور صبح تک اسے فارغ کر دیا جائے گا۔ کوٹ پتلون والا وجنتی کا باپ تھا۔

وجنتی کو ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ میں نے اُسے بلایا۔ وہ تو بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اُس کے بال کٹے ہوئے تھے۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے وجنتی!" ——— مَیں نے اُسے کہا ——— "میرے ساتھ ایک انگریز انسپکٹر ہے۔ اُس سے ڈرنا نہیں۔ مَیں ساتھ ہوں گا۔ تمہیں ایک منٹ کے لئے بھی اس کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑا جائے گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھنا۔ میں ہندوستانی ہوں۔"

"مجھ سے کیا پوچھا جائے گا؟" ——— اُس نے پوچھا ——— "یہ معاملہ کیا ہے؟"

"جو کچھ بھی پوچھا جائے گا وہ ٹھیک ٹھیک بتا دینا" ——— مَیں نے کہا اور اُس کے باپ سے کہا ——— "آپ گھر چلے جائیں، یہاں برآمدے میں کھڑے رہیں، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ کی لڑکی ہمارے پاس امانت رہے گی۔"

مَیں اس لڑکی کے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اُس پر میری تسلیاں ذرا سا

بھی اثر نہیں کر رہی تھیں۔ اُس کی بیٹی اتنی دلکش امانت تھی کہ کوئی مومن بھی اس میں خیانت کی کوشش کر سکتا تھا۔ میں تفتیش کے کمرے میں چلا گیا۔ ہمارے لئے چائے آچکی تھی جس کی اُس وقت شدید ضرورت تھی۔

ساڑھی میں لپٹی ہوئی ایک چیز

"سٹرملک!" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "کیا تم تھک نہیں گئے؟ .... مَیں کچھ تھکن محسوس کرنے لگا ہوں۔"

"ابھی ہم دونوں کی تھکن دُور ہو جائے گی" — میں نے ہنستے ہوئے کہا — "بڑی خوبصورت ساڑھی آ رہی ہے۔ اس میں جو چیز لپٹی ہوئی ہے وہ تمہارے اعصاب کو سکون دے گی۔"

ہمارے بلاوے پر ساڑھی اندر آگئی۔ انسپکٹر ٹینیسن اُسے چند سیکنڈ دیکھتا رہا۔ مَیں نے وجنتی کو بیٹھنے کو کہا۔ ٹینیسن نے اُس سے پوچھا کہ وہ انگریزی سمجھ اور بول سکتی ہے یا نہیں۔ اُس نے انگریزی میں کہا کہ وہ روانی سے انگریزی بول سکتی ہے۔ اُس کے اِس ایک جملے سے ہی ہم نے اندازہ کر لیا کہ وہ بڑے اچھے طریقے سے انگریزی بول سکتی ہے۔ مَیں نے اُسے کہا کہ جہاں اُسے دشواری محسوس ہو وہ اُردو میں اپنی بات واضح کر دے کیونکہ یہ قتل کی تفتیش ہے اور ہر بات پوری طرح واضح ہونی چاہیئے۔ اُسے یہ بھی کہا کہ وہ بات چھپانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ ہم کافی شہادت حاصل کر کے اُسے شاملِ تفتیش کر رہے ہیں۔

"یہ تفتیش ایک کرسچن لڑکی ڈیزی کے قتل کے سلسلے میں ہو رہی ہے" — مَیں نے اُسے بتایا — "تم ڈیزی کو جانتی ہو۔ وہ تمہارے دوست ڈینئیل کی بیوی تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ڈیزی قتل ہو چکی ہے۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے" — اُس نے کہا۔

"تمہیں ڈینئیل نے بتایا ہوگا!" — میں نے کہا۔

"اُسی نے بتایا تھا" — اُس نے کہا۔

"کیا اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ڈیزی مر گئی ہے؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا — "یا یہ کہا تھا کہ وہ مار دی گئی ہے؟"

"اور یہ بھی بتاؤ وجنتی!" — میں نے پوچھا — "اُس نے تمہیں کب اور کیا اطلاع دی تھی .... میں تمہیں ایک بار پھر خبردار کرتا ہوں کہ جواب دینے سے پہلے سوچ لینا کہ یہ قتل کا کیس ہے۔ تمہاری زبان کی ذرا سی لغزش تمہیں اِس کیس میں ملزمہ کا درجہ دے سکتی ہے۔"

"مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں" — اُس نے بڑے پختہ لہجے میں کہا — "ڈینئیل نے اپنی بیوی کے مرنے کے تیسرے روز مجھے بتایا تھا اور اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ڈیزی کے باپ اور بھائی نے تھانے میں رپورٹ دی ہے کہ ڈیزی کو قتل کیا گیا ہے اور لاش پولیس نے قبضے میں لے لی۔ پوسٹ مارٹم ہُوا اور پتہ چلا ہے کہ اُسے کسی زہریلی دوائی کا انجکشن دیا گیا ہے۔"

"وہ بہت پریشان ہوگا!" — ٹینیسن نے کہا۔

"دیکھو مس وجنتی!" — میں نے کہا — "ہم تمہیں بہت بڑی پریشانی سے بچا سکتے ہیں۔ تم ہمارا وقت بچاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیرا پھیری نہیں کریں گے۔ آؤ سیدھی سیدھی بات کریں۔ تم خود گریجویٹ ہو۔ تمہارا باپ صاحبِ حیثیت اور معزز آدمی ہے .... بات یہ ہے کہ تم اور ڈینئیل ایک دوسرے کو اتنا چاہتے تھے کہ تم نے شادی تک کا ارادہ کر لیا تھا لیکن درمیان میں ڈیزی تھی جسے تم دونوں نے یا صرف ڈینئیل نے یا تم نے اپنے انتظامات کے تحت زہر کے انجکشن سے راستے سے ہٹا لیا ہے۔"

"یہ ایسا الزام ہے جسے میں تصور میں بھی نہیں لا سکتی" — اُس نے کہا — "اور میں ڈینئیل کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"اس کے ساتھ تمہاری دوستی کیسی ہے؟" — میں نے پوچھا — "محبت والی؟ ناجائز تعلقات والی؟"

"عام قسم کی دوستی ہے" — اُس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا —
"اتنی زیادہ بے تکلفی نہیں .... میں ناجائز تعلقات رکھنے والی لڑکی نہیں۔"

میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے اُسے سوالوں اور جرح کے جال میں لانا شروع کر دیا۔ مشتبہ کے لئے یہ طریقۂ تفتیش بڑا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اُس پر سوالوں کی یلغار کر دی جاتی ہے۔ ایک ایک سوال گھما پھرا کر کئی بار پوچھا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایک سوال کا جواب دیتا ہے تو اُسے کہا جاتا ہے کہ پہلے تم نے کچھ اور جواب دیا تھا اب یہ کہہ رہے ہو حالانکہ پہلے بھی اُس نے یہی جواب دیا ہوتا ہے۔ اس طرح مشتبہ اگر جھوٹا ہو تو وہ ایسا بھٹکتا ہے کہ سچ بات پر آجاتا ہے۔ اگر سچ پر نہ آئے تو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کچھ چھپا رہا ہے، پھر اُسے تھرڈ ڈگری (ایذا رسانی) کی چکی میں پیسا جاتا ہے۔ سی آئی اے کو لامحدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ کسی مشتبہ سے راز اگلوانے کے لئے اُس کی ہڈیاں بھی توڑ دی جاتیں تو اُس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا تھا۔

اس ہندو لڑکی کو ہم ایذا رسانی سے بچانا چاہتے تھے۔ سوال و جواب کے دوران انسپکٹر ٹینیسن نے اُسے کہا کہ تم یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ تم کنواری ہو۔ ہم لیڈی ڈاکٹر کو یہیں بُلا کر چیک اپ کروائیں گے کہ تم کنواری ہو یا نہیں۔

لڑکی ذہنی طور پر غیر معمولی ہوشیار تھی۔ ہر سوال کا جواب خود اعتمادی سے دیتی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا جو قائم رہا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لڑکی بے حد چالاک ہے۔ ہم اُس سے یہ کہلوانا چاہتے تھے کہ ڈینیل کے ساتھ اُس کی دوستی اتنی گہری تھی کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی یا ڈینیل کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات تھے۔ اگر تھے بھی تو پولیس کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہم اُس سے یہ ٹوہ لینے کی کوشش کر رہے تھے کہ ڈینیل اپنی بیوی سے بہت تنگ تھا اور اُس سے آزاد ہونے کی باتیں کرتا تھا۔

میں نے انسپکٹر ٹینیسن کو باہر چلنے کا اشارہ کیا اور میں اُٹھا۔ وجنتی کو کمرے میں چھوڑ کر ہم دونوں برآمدے میں چلے گئے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس لڑکی کے باپ سے بات کرتے ہیں کہ وہ اسے سمجھائے ورنہ ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔ آپس میں بات کر کے وجنتی کے باپ کو بلایا اور اُسے ایک بار پھر بتایا کہ یہ قتل کی واردات کی تفتیش ہے اور لڑکی کا تعلق اس واردات کے ساتھ اس طرح ہے کہ قتل کا جس پر شُبہ کیا جا رہا ہے اُس کے ساتھ وجنتی کی دوستی تھی۔

"آپ بیٹی سے کہیں کہ ہمیں چکر دینے کی حماقت نہ کرے" — میں نے اُسے کہا — "ورنہ ہم اسے بھی قتل کے شُبے میں اپنی تحویل یا حراست میں لے لیں گے۔ ہم سی آئی اے کے افسر ہیں۔ ہم ایسی نوازش کسی پر نہیں کیا کرتے جو آپ پر کر رہے ہیں۔ ہم سچ بات اگلوا لیا کرتے ہیں لیکن بندے کا حُلیہ بگڑ چکا ہوتا ہے۔ آپ اپنی سوشل حیثیت کا بھی خیال رکھیں۔ یہ کیس اخباروں میں آئے گا۔ اس میں آپ کی بیٹی کو ملوث نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے کہیں کہ مقتولہ کے خاوند کے متعلق یہ جو کچھ بھی جانتی ہے بتا دے۔"

باپ اندر چلا گیا۔ ہم باہر کھڑے رہے۔ وہ بیٹی کے ساتھ اچھا خاصا وقت لگا کر باہر آیا اور ہمیں بتایا کہ لڑکی جو کچھ بھی جانتی ہے بتا دے گی۔ میں اور انسپکٹر ٹینیسن کمرے میں گئے۔ وجنتی خوش و خرم بیٹھی تھی۔ ہم نے اُس سے وہی سوال پوچھے جو پہلے پوچھتے رہے تھے۔ اُس نے اب ذرا مختلف جواب دینے شروع کر دیئے۔

اب اُس کا بیان اُس کے جوابوں کو ملا کر یوں بنا کہ ڈینیل کے ساتھ اُس کے تعلقات جسمانی نہیں تھے اور وہ ایسے تعلقات رکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ دوستی کی خواہشمند تھی۔ ڈینیل کا مطالبہ جسمانی تھا۔ آخر ڈینیل نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ڈینیل نے اپنی بیوی کے خلاف بیزاری کا اظہار شروع کر دیا۔

یہ تو عام مشاہدے کی بات ہے کہ شادی شدہ آدمی کسی غیر عورت

کے ساتھ دوستی لگانا چاہتا ہے تو اُس کے سامنے اپنی بیوی میں سَو سَو کیڑے نکالتا ہے۔ اس عورت سے کہتا ہے کہ تمہارے مقابلے میں تو وہ تمہاری جُوتی کے بھی برابر نہیں۔ اس قسم کے مکالمے بولتا ہے کہ اپنی بیوی سے میں روحانی تسکین چاہتا ہوں لیکن وہ صرف جسم ہے اور اس جسم سے مجھے نفرت ہے۔ اسی طرح کوئی شادی شدہ عورت کسی غیر مرد سے دوستی لگانا چاہتی ہے تو اپنے خاوند کو اس آدمی کے مقابلے میں بھدّا، بدشکل اور کوڑھ مغز ثابت کرتی ہے۔

یہی حرکت ڈینیل وجنتی کے ساتھ کرتا رہا۔ وجنتی کے بیان سے ظاہر ہُوا کہ وہ ڈیزی کو بدصورت لڑکی سمجھتی رہی۔ اُس نے ڈیزی کو دیکھا تو حیران ہوئی کہ یہ تو اُسی جیسی خوبصورت لڑکی ہے۔ بہرحال وجنتی کے بیان کے مطابق اُسے ڈینیل اتنا اچھا لگتا تھا کہ اُس نے اُس کی دوستی کو خاصی بے تکلفی کی حد تک قبول کیا۔ وہ تنہا کہیں جا کر پیار و محبت سے دل بہلاتے تھے۔ فرق صرف یہ رہ گیا تھا کہ جسمانی تعلق قائم نہیں ہُوا تھا۔

ہمارے پوچھنے پر وجنتی نے بتایا کہ ڈینیل نے کئی مرتبہ کہا تھا کہ وہ ڈیزی سے آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن جیتے جی یہ ممکن نہیں۔ ڈینیل نے وجنتی کو یہ بھی بتایا تھا کہ ڈیزی ابھی تک عمران کو چاہتی ہے اور اُسے ملتی ملاتی بھی ہے۔

"کیا تم نے کسی بھی وقت نہیں سوچا تھا کہ تم ڈینیل کے ساتھ شادی کر لو؟" — میں نے پوچھا۔

"وہ تو یہی ایک مطالبہ دُہراتا رہتا تھا کہ میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں" — وجنتی نے جواب دیا — "مجھے اس کا یہ مطالبہ کبھی کبھی اچھا لگتا تھا لیکن سوال مذہب کا تھا۔ وہ اپنا مذہب چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ یہی مجبوری میری تھی" — مجھے آج تک یاد ہے کہ وہ بولتے بولتے رُک گئی تھی اور مسکراتے ہوئے اُس نے کہا تھا — "میں دراصل چاہتی تھی کہ وہ ہندو ہو جائے۔"

"ذرا سوچ کر بتاؤ" — انسپکٹر ٹینیسن نے اُس سے پوچھا — "ڈینیل نے جب تمہیں ڈیزی کی موت کی اطلاع دی تھی تو اُس کا موڈ کیسا تھا؟ اُس نے خوشی کے لہجے میں یہ خبر سنائی تھی یا اُداس تھا؟"

"خوش بھی تھا اُداس بھی" — وجنتی نے جواب دیا — "خوش اس لئے کہ جس بیوی سے وہ آزادی چاہتا تھا وہ مر گئی تھی اور اُداس اس لئے کہ لاش پولیس کے قبضے میں چلی گئی تھی اور پوسٹمارٹم رپورٹ یہ تھی کہ اُس کی بیوی کو زہر کا انجکشن دیا گیا تھا۔"

"اُس نے کوئی خاص بات کہی تھی؟" — میں نے پوچھا — "میرا مطلب ہے کوئی ایسی بات جس سے خوشی کا یا اُس کے دِلی ردِ عمل کا اظہار ہوتا ہو؟"

وجنتی نے ذہن پر زور دیا۔

"باتیں تو بہت ہوتی تھیں" — وجنتی نے جواب دیا — "ایک بات یاد آتی ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ زندگی میں بھی اس عورت نے مجھے پریشان رکھا اور مر کر بھی پریشانی پیدا کر گئی۔ میں تو خوش تھا کہ اس سے جان چھوٹی۔"

"اب تم جھوٹ بولو گی" — میں نے کہا — "کیا اُس نے ڈیزی کو خود زہر کا انجکشن دلوایا تھا؟"

"مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں" — وجنتی نے کہا — "اگر اُس نے ایسا کیا بھی تھا تو مجھے نہیں بتایا تھا۔ میرا خیال ہے یہ ایک خطرناک راز ہے جو وہ مجھے بتانے سے ڈرتا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "کہ اُس نے کبھی تم سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کر دینا چاہتا ہے اور تم نے اُسے ڈرایا تھا۔"

"ہاں!" — وجنتی نے کہا — "ایک بار اُس نے اس قسم کی بات کہی تھی کہ وہ کبھی کبھی ڈیزی سے اتنا تنگ آجاتا ہے کہ وہ سوچنے لگتا ہے

کر اسے ایسے طریقے سے ختم کر دوں کہ قتل کا شبہ نہ ہو.... ہو سکتا ہے ڈینئیل نے یہ بات جذبات یا میری محبت سے مغلوب ہو کر کی ہو اور یہ اُس کا پختہ ارادہ نہ ہو، لیکن میں نے اُسے سختی سے منع کیا کہ وہ ایسی بات ذہن میں لاتے ہی نہیں۔ میں بہت بُری لڑکی ہو سکتی ہوں، لیکن ہندو ہوتے ہوئے میں کسی جانور کی موت کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ تو ایک انسان کی جان کا معاملہ تھا۔ اگر ڈیزی ڈینئیل کو پسند نہیں تھی تو یہ ڈیزی کا اتنا سنگین جرم نہیں تھا کہ اُسے قتل کر دیا جاتا۔ میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ مجھے شک ہو گیا تھا کہ اپنی بیوی کو ڈینئیل نے خود ہی زہر کا انجکشن دیا یا دلوایا ہے، لیکن میں نے اُس کے ساتھ اس شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔"

"اب تو اُس نے تم پر زور دیا ہو گا کہ تم اُس کے ساتھ شادی کر لو" — میں نے کہا۔

"ہاں" — وجنتی نے جواب دیا — "اس نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ ڈیزی کے مرنے کے بعد کئی مرتبہ کہہ چکا ہے کہ کچھ دن اور انتظار کر کے شادی ہو جانی چاہیئے۔ اس سے میرا یہ شک پختہ ہو جاتا ہے کہ اپنی بیوی کا قاتل یہی ہے۔"

وجنتی کی یہ باتیں سُن کر مجھے خیال آیا کہ اسی کو ڈینئیل سے یہ اگلوانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے کہ اپنی بیوی کا قاتل یہی ہے۔ اگر وجنتی اُسے کہتی کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرے گی بشرطیکہ وہ یہ بتا دے کہ بیوی کو اُس نے خود قتل کیا یا کروایا ہے، لیکن مجھے قانون کا خیال آ گیا۔ اگر وجنتی اُس سے یہ راز اگلوا بھی لیتی اور عدالت میں یہ بیان دیتی کہ ڈینئیل نے خود بتایا تھا کہ بیوی کو اُسی نے زہر دیا ہے تو عدالت اسے قبول نہ کرتی کیونکہ گواہ کی رائے کو ٹھوس شہادت کے بغیر قانون تسلیم نہیں کرتا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ وجنتی ہی دھوکا دے جاتی۔ بہرحال ہمارے اس شک کی تصدیق پھر بھی ہوتی تھی کہ مقتولہ کا قاتل ڈینئیل ہی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ انجکشن اُس نے خود دیا یا ہسپتال کے کسی ملازم کو پیسے دے کر دلوایا ہے۔

ہمیں یہ یقین بھی کرنا تھا کہ اس قتل میں وجنتی ملوث نہیں۔ اس مقصد کے لئے اُس سے پوچھ گچھ کی۔ وہ یہی کہتی رہی کہ اُس نے ڈینئیل کے ساتھ شادی کرنی ہی نہیں تھی۔ ایک وجہ تو وہ پہلے بتا چکی تھی کہ وہ ڈینئیل کو ہندو بنانا چاہتی تھی۔ اب اُس نے ایک وجہ اور بتائی۔ وہ یہ کہ مالی لحاظ سے یعنی آمدنی کے لحاظ سے ڈینئیل وجنتی کے مقابلے میں خاصا نیچے تھا۔ مختصر یہ کہ وجنتی پر بڑا ہی کمزور سا شک تھا کہ اس واردات میں یہ بھی ملوث ہے۔

ہم نے وجنتی کے باپ کو اندر بلا کر تسلی دی کہ وجنتی ملزم یا مشتبہ نہیں بلکہ گواہ ہے اور اسے یہی بیان دینے کے لئے عدالت میں آنا پڑے گا۔ باپ نے بڑی خوشی سے کہا کہ وہ وجنتی کو جب بھی کہا گیا، عدالت میں خود لے کر آئے گا۔

مسلمان ہونا چاہتی تھی

عمران علی بھی آیا ہُوا تھا۔ ہم نے اُسے بلایا۔ صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ عمران بھی خوبرو جوان تھا۔ اُس کے ساتھ جونہی بات ہوتی اُس نے کہا کہ وہ اس واردات سے بڑی اچھی طرح واقف ہے اور وہ ڈینئیل اور ڈیزی کو بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ مقتولہ کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے رہے ہیں اور کیا یہ صحیح ہے کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔

"بالکل صحیح ہے جناب!" — عمران علی نے اُردو میں جواب دیا اور بولا — "میں فورتھ ایئر میں کالج سے بھاگ نکلا تھا۔ انگریزی بہت پڑھی ہے لیکن یہ زبان بولنے کا اتنا زیادہ تجربہ نہیں ہُوا کہ پورا بیان انگریزی میں دے سکوں.... ڈیزی سے مجھے دِلی نہیں بلکہ روحانی پیار تھا! ہم نے شادی کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ ابھی یہ فیصلہ نہیں ہُوا تھا کہ ہم دونوں میں سے کون اپنا مذہب چھوڑے۔ مجھے یقین تھا کہ ڈیزی اپنا مذہب چھوڑ کر

مسلمان ہونے پر آمادہ تھی۔ میں نے اپنے دوستوں کو بتا دیا تھا کہ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔ یہ میری غلطی تھی۔ ڈیزی پہلے مسلمان ہو جاتی پھر میں سب کو بتاتا کہ اس لڑکی نے میری خاطر اپنا مذہب چھوڑا ہے اس لئے میں اس کے ساتھ شادی کروں گا ....

"میں نے پہلے ہی اپنے دوستوں کو بتا دیا تھا۔ ان میں سے کسی نے میرے والد صاحب کو بتا دیا کہ عمران ایک عیسائی لڑکی کے پیچھے اپنا مذہب چھوڑ رہا ہے۔ میرے والد صاحب، ایک تایا اور ایک چچا بڑے ہی سخت طبیعت انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنی حراست میں بٹھا لیا اور اگلے ہی دن قریبی رشتہ داروں میں ایک لڑکی کے ساتھ میری منگنی کر دی۔ ویسے تو میرے والد صاحب نے مجھے شہزادہ بنا کے رکھا ہوا ہے، میرے پاس گاڑی بھی ہے، لیکن ان معاملات میں وہ بڑے سخت ہیں۔ انہوں نے جو فیصلہ مجھ پر ٹھونسا تھا وہ میں نے دل پر پتھر رکھ کر قبول کر لیا ہے۔ مجھے بہت صدمہ ہوا اور ڈیزی کو تو شاید کچھ زیادہ ہی صدمہ ہوا ہو گا .... اس سے پہلے کہ آپ کوئی الٹا سیدھا سوال کریں، میں آپ کو سچ سچ بتا دیتا ہوں کہ میری اور ڈیزی کی محبت کوئی گندی محبت نہیں تھی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مجھ جیسے مسلمان امیر زادے اور عیسائی عورتیں گندی قسم کی عیاشی کرتی ہیں، یہ ہے بھی صحیح لیکن اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ کم از کم میں اور ڈیزی اس الزام سے پاک تھے۔ ڈیزی اخلاق اور کردار والی لڑکی تھی" — وہ چپ ہو گیا۔ اس کا سر جھک گیا پھر اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور سسکنے لگا۔

میں اور انسپکٹر ٹینیسن اسے دیکھتے رہے۔ جب وہ سنبھل گیا تو اس نے معذرت کی کہ ایک بڑے سنگین معاملے کی گفتگو میں جذباتی ہو گیا تھا۔ اس نے بہت سی باتیں کی تھیں۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ یہ شخص اس واردات میں ملوث نہیں۔

"کیا ڈیزی شادی کے بعد بھی تمہیں ملتی رہتی تھی؟"

"جی ہاں" — اس نے جواب دیا — "وہ مجھے ملتی تھی اور میں اسے کہتا تھا کہ جو ہو گیا سو ہو گیا، تم اپنے خاوند کو قبول کر لو اور میں اپنی بیوی کو قبول کر لیتا ہوں۔ ہم دونوں نے ایسے ہی کیا۔ ڈیزی دو سال تو خوش رہی، لیکن تقریباً ایک سال سے وہ پریشان تھی۔ وجہ یہ بتاتی تھی کہ ڈینیل اسے تنگ کرنے لگا ہے اور طرح طرح کے الزام لگاتا ہے۔ ایک الزام تو یہ لگاتا تھا کہ وہ مجھ سے ملتی ملاتی ہے۔ میں نے اس سے ملنا کم کر دیا تھا، لیکن میل ملاقات لگی رہتی تھی۔ تین مرتبہ ڈینیل مجھے ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ میں ڈیزی سے ملنا چھوڑ دوں۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی تھی، لیکن وہ ٹھنڈا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ تیسری بار اس نے مجھے یہ دھمکی دی کہ میں نے ڈیزی سے ملنا نہ چھوڑا تو وہ میرے ٹھیکے کینسل کرا دے گا۔ اس نے مجھ پر غصہ بھی جھاڑا تھا جو میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اسے نوکری سے برطرف کرا دوں گا۔ اس طرح ہمارے درمیان خاصی تلخ کلامی اور جھک جھک ہوئی تھی اور میں نے اسے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں ڈیزی سے ملنا نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے یہ بات غصے میں کہہ دی تھی۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ اس طرح یہ شخص ڈیزی کی زندگی مزید تلخ کر دے گا۔"

"یہ کب کا واقعہ ہے؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"ڈیزی کی موت سے چودہ پندرہ دن پہلے یہ بات ہوئی تھی" — عمران نے جواب دیا۔

"کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو جو ابھی ابھی یہاں تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — اس نے جواب دیا — "کیا یہ وہ لڑکی تو نہیں جس کے ساتھ ڈینیل نے دوستی لگا رکھی ہے؟ یہ لڑکی بھی ڈینیل اور ڈیزی کے درمیان لڑائی جھگڑے کی وجہ بنی ہوئی تھی۔ ڈیزی مجھے بتاتی رہتی تھی کہ وہ ڈینیل کو اس لڑکی سے ملنے سے روکتی تھی اور ڈینیل الٹا ڈیزی پر

میرے تعلق سے بے وفائی کا الزام لگاتا تھا۔ ڈینئیل ڈیزی سے کہتا رہتا تھا کہ وجنتی کے مقابلے میں تم کچھ بھی نہیں ہو۔"

ہمارا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے عمران واردات میں ملوث ہو۔ ہم نے وجہ یہ سوچی تھی کہ اس نے کبھی ڈیزی سے کہا ہو گا کہ کورٹ میں جا کر ڈینئیل سے علیحدگی حاصل کر لو اور ہو سکتا ہے وہ نہ مانی ہو، لیکن ہمیں کوئی ایسا اشارہ نہ ملا۔ تفتیش بڑی لمبی تھی۔ اس دوران معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ عمران کو شک ہو گیا کہ ہم اُس پر قتل کا شبہ کر رہے ہیں۔

"دیکھئے جناب!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اگر میں قتل کرنا چاہتا تو ڈینئیل کو قتل کرتا۔ ڈیزی کو تو میں نے زندہ رکھنا تھا۔"

"اپنی بیوی کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"مجھ سے نہ پوچھیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "میری بیوی سے، اُس کے ماں باپ اور اُس کے بہن بھائیوں سے پوچھیں۔ میں نے اُس کے ساتھ شادی کی ہے، اُسے خوش اور مطمئن رکھنا میرا فرض ہے۔ مجھے اپنی بیوی سے کوئی شکایت نہیں۔"

صبح سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہوئیں تو ہم نے عمران کو فارغ کیا اور ہم کچھ آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ پیچھے یہ حکم چھوڑ گئے کہ ڈینئیل کی ماں کو بلا کر بٹھا لیا جائے۔

شرابی اور عورتوں کا شکاری

صبح کے گئے ہوئے ہم دوپہر کا کھانا کھا کر واپس تفتیش کے کمرے میں آئے۔ ڈینئیل کی ماں کو آئے ہوئے اڑھائی تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ ہم نے اُسے کمرے میں بلایا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ عورت بھی ڈیزی کے ساتھ بدسلوکی کرتی تھی۔ اُس سے پوچھا کہ ڈینئیل اور ڈیزی کے درمیان ناچاقی کی وجہ کیا تھی۔ اُس نے وہی وجوہات بتائیں جو ڈینئیل

بتا چکا تھا۔

ہم نے اُس سے لڑائی جھگڑے کی تفصیل پوچھی تو اُس نے بتایا کہ تین چار مہینوں سے ان کی آپس میں بول چال تقریباً بند ہو گئی تھی۔ اس عورت نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ڈینئیل نے ڈیزی کو دو تین مرتبہ مارا پیٹا بھی تھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ڈینئیل کی دوستی ایک بڑی خوبصورت ہندو لڑکی کے ساتھ ہے؟" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"یہ ایک جھوٹا الزام ہے" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "ڈیزی اور اس کے ماں باپ نے میرے بیٹے پر یہ الزام لگا رکھا ہے۔"

ہم نے نوٹ کیا کہ ڈینئیل نے کہا تھا کہ اُس نے ڈیزی کو کبھی بھی مارا پیٹا نہیں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا تھا کہ ڈینئیل کی وجنتی کے ساتھ دوستی تھی لیکن ماں اس سے انکار کر رہی تھی۔ اس کے بعد ہم نے اس عورت سے جتنی بھی پوچھ گچھ کی اس میں وہ یہی ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ ڈیزی بہت بُری لڑکی تھی اور ڈینئیل اُس سے تنگ تھا۔

"کیا تم بھی ڈیزی کے سلوک سے تنگ تھیں؟" ـــــ میں نے اُس سے پوچھا ـــــ "کیا تمہارے ساتھ بھی وہ بدتمیزی کرتی تھی؟"

"مجھے اُس نے کیا تنگ کرنا تھا" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ نوکری کرتی تھی، تنخواہ میں سے کچھ پیسے مجھے دے دیتی تھی۔ میرے لئے یہی پریشانی کافی تھی کہ میرا بیٹا اُس سے خوش نہیں تھا۔ میرا بیٹا اُس کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ اُسے ذرا سی تکلیف ہوتی تو ڈینئیل اُسے ہسپتال لے گیا اور پرائیویٹ کمرے میں رکھا۔"

"تکلیف کیا تھی؟"

"ڈاکٹر نے ہیضہ بتایا تھا" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "یہ سنتے ہی ہم اُسے ہسپتال لے گئے اور داخل کرا دیا۔ میں اُس کے ساتھ رہی۔"

ہمارے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ کون کون سا ڈاکٹر کمرے میں آتا تھا، نرس اور دیگر ملازموں کے متعلق بھی اُس سے دریافت کیا۔ اُس

نے سب کے نام بتائے۔

"آخری وقت تم اُس کے ساتھ تھیں" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا ـــــ "تمہیں کس وقت پتہ چلا تھا کہ ڈیزی مر گئی ہے۔ کیا وہ بہتر نہیں ہو گئی تھی؟"

"آخری روز وہ خاصی بہتر تھی" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ ٹھیک ٹھاک باتیں کر رہی تھی۔ گلوکوز ابھی تک لگا ہُوا تھا۔ شام کے بعد میں نے اُسے کہا کہ میں گھر چلی جاؤں تو کوئی حرج تو نہیں۔ اُس نے کہا، چلی جاؤ، اب تو مَیں تقریباً ٹھیک ہوں۔ ڈیوٹی نرس سے کہہ جانا کہ خیال رکھے۔ میں گھر چلی گئی۔ صبح تین بجے ہمارے پڑوسی کرنل نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔ میں نے ہی اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ اُس نے بتایا کہ ہسپتال سے فون آیا ہے۔ میں دوڑی گئی۔ ہسپتال سے کوئی آدمی بول رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ڈیزی مر گئی ہے۔ میں نے ڈینیل کو بتایا اور ہم ہسپتال چلے گئے۔"

اُس کے یہ الفاظ کہ وہ اُس رات گھر پر تھی، ہمارے کانوں میں یوں پڑے جیسے دھماکہ ہُوا ہو۔ ڈینیل نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ آخری وقت اُس کی ماں ڈیزی کے ساتھ ہسپتال میں تھی اور اُسی نے ہسپتال سے فون پر ڈیزی کی موت کی اطلاع دی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس عورت سے کہلوایا کہ وہ اُس رات ہسپتال میں نہیں بلکہ گھر پر تھی۔ اب تو کوئی شک ہی نہ رہا کہ قاتل ڈینیل ہے۔ ڈینیل سے اقبالِ جرم کرانا تھا یا ٹھوس شہادت اقبالِ جرم کے بغیر ہی اکٹھی کرنی تھی۔

ہم نے ڈینیل کی ماں کی تفتیش چند اور باتیں دریافت کر کے روک دی اور اُسے الگ بٹھا دیا اور ڈینیل کو بلایا۔

"مسٹر ڈینیل!" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے اُس سے پوچھا ـــــ "کیا تم اقبالی بیان دینا پسند کرو گے؟"

"آپ لوگ کس جرم کا مجھ سے اقبالی بیان لینا چاہتے ہیں؟" ـــــ اُس نے تڑپتے ہوئے پوچھا۔ اُس کی آواز رندھی ہوئی تھی جس میں احتجاج بھی تھا اور گھبراہٹ بھی۔

"یہ بتا دو کہ تم نے بیوی کو زہریلی دوائی کا انجکشن کس سے لگوایا تھا؟" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

وہ قسمیں کھانے اور پہلے سے زیادہ تڑپنے لگا۔

"مسٹر ڈینیل!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اگر یہی بتا دو کہ انجکشن کس سے دلوایا تھا تو تمہارے بچنے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ کہتا رہے کہ اُس نے تمہارے کہنے پر زہر کا انجکشن دیا تھا، تم انکار کر دینا۔ تم نے اُسے تحریر تو نہیں دی تھی۔"

اُس نے تڑپ تڑپ اور چیخ چلّا کر انکار کیا۔ وہ پوچھتا تھا کہ اُس کے خلاف ثبوت اور شہادت کیا ہے۔ ہم نے اُسے کچھ بھی نہ بتایا۔ جب دیکھا کہ وہ ہماری بات پر نہیں آ رہا تو ہم نے اُسے حوالات میں بند کر دیا۔

ہم نے اُسی وقت ہسپتال جانے کا ارادہ کر لیا۔ ہمیں سب سے پہلے ہسپتال جانا چاہیئے تھا لیکن ہم نے یہ سوچا تھا کہ اردگرد سے شہادت اکٹھی کر لیں۔ ہمارے خیال میں شہادت کافی فراہم ہو گئی تھی۔ ہم ہسپتال کے لئے روانہ ہونے لگے تو دو مُخبر آ گئے۔ ہم اُن سے رپورٹ لینے کے لئے رُک گئے۔

انہوں نے وجنتی کے متعلق بتایا کہ بظاہر زندہ دل اور سوشل لڑکی ہے۔ اس کا باپ کانگرس کا بڑا اہم فرد اور صنعتکار ہے۔ وجنتی کا زیادہ ملنا جُلنا ایسے افراد کے ساتھ تھا جن کا تعلق جی ایچ کیو اور ایئر ہیڈ کوارٹر کے ساتھ تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اُس کے باپ نے اُسے کُھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ اُسے پُراسرار لڑکی بھی کہا جاتا تھا۔

ڈینیل کی رپورٹ زیادہ واضح تھی۔ وہ اثر و رسوخ والا آدمی تھا اور کسی پہلو شریف آدمی نہیں تھا۔ یہ کمیونسٹ شراب پیتی تھی لیکن ڈینیل ضرورت

سے زیادہ شرابی اور عورتوں کا شکاری تھا۔ اُس کا یارانہ ایسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ تھا جو اچھی شہرت کے آدمی نہیں تھے۔ وہ خود بھی غنڈہ اور بدمعاش قبیل کا آدمی تھا۔

ڈیزی اور عمران علی کے متعلق بھی رپورٹیں ملیں۔ ان میں سوائے اس کے کوئی خاص بات نہیں تھی کہ یہ دونوں اکثر اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔

ان مخبروں سے ہم فارغ ہو کر ہسپتال چلے گئے۔ شام ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر انچارج کو گھر سے بلایا۔ وہ ہندو تھا۔ ہم اُس کے کمرے میں بیٹھ گئے۔

مسلمان نے شرمندہ کروایا

"ڈاکٹر!" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے اپنا اور میرا تعارف کرا کے کہا ـــ "ہم مسز ڈینیل کے قتل کی تفتیش کے لئے آئے ہیں۔ ہم آپ سے سب سے پہلی بات یہ کہتے ہیں کہ آپ نے تھانے کے سب انسپکٹر دیوراج کو یہ کہہ کر بہت بڑی غلطی کی تھی کہ وہ تفتیش کو ہسپتال سے باہر رکھے کیونکہ اس میں آپ کی اور ہسپتال کی بے عزتی ہے۔ دیوراج آپ کا احسان مند تھا کہ آپ نے اُس کے بچے کا علاج ایسے طریقے سے کیا تھا جو انسانی ہمدردی کا بہترین نمونہ ہے لیکن آپ نے اس سے غلط فائدہ اُٹھایا اور تفتیش خراب کر دی۔"

"مجھے اس کا بہت افسوس ہے" ـــ ڈاکٹر نے باوقار انداز سے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا ـــ "میں نے اُسے یقیناً کہا تھا کہ میری اور ہسپتال کی بے عزتی ہو گی۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ یہ تھانیدار میرے احسان کا صلہ یہ دے گا کہ تفتیش کو ہی خراب کر دے گا۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی حیثیت اور پوزیشن سے گر کر ایک بات کہہ دی تھی۔"

یہ شخص واقعی معزز آدمی تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو کسی الزام سے

بچانے کے لئے کوئی غلط جواز پیش نہ کیا نہ اپنی وکالت میں کچھ کہا بلکہ معافی مانگی اور اُس نے یہ بھی پوچھا کہ اُس کی غلطی کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ ہم نے اُسے کہا کہ ہم جو کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیں بالکل صحیح معلوم ہو جائے اور اس مقصد میں وہ ہماری مدد کرے۔

"آپ پوچھیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "آپ کو صحیح جواب ملیں گے۔"

ہمارے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ دن میں دو بار صبح اور شام چار بجے کے لگ بھگ، راؤنڈ پر نکلتا ہے اور جنرل وارڈ اور کمروں کے مریضوں کو دیکھتا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اُن دنوں ہسپتالوں میں مریضوں کا یہ رش نہیں ہوتا تھا جو آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ برآمدوں میں بھی جگہ نہیں ملتی۔ اُس وقت وارڈ آدھے سے زیادہ خالی رہتے تھے اور کمروں میں کوئی امیر کبیر مریض جاتا تھا۔

مقتولہ کے متعلق اُس نے بتایا کہ اُسے ہیضہ ہو گیا تھا اور اُس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ آخری روز وہ خطرے سے نکل گئی تھی مگر اگلے روز صبح اُسے بتایا گیا کہ مریضہ مر گئی ہے۔

"میں نے پہلی بات یہ پوچھی کہ گلوکوز اتار تو نہیں دیا گیا تھا؟" ـــ ڈاکٹر نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا ـــ "مجھے بتایا گیا کہ گلوکوز مرتے وقت تک لگا رہا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ مریضہ سنبھل چکی تھی پھر وہ مری کیسے؟ موت کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اُسے اسی مرض کا ایک اور حملہ ہو گیا ہو گا یا نمونیہ، یرقان یا ایسی کسی بیماری کا حملہ ہو گیا۔ مریضہ پہلے ہی بہت کمزور تھی۔ اُس کے جسم سے نمی بہت کم ہو گئی تھی جسے DEHYDERATION ـــ کہتے ہیں۔ اس سے موت واقع ہو سکتی تھی۔ دوسری وجہ یہ سمجھ میں آتی تھی کہ گلوکوز کی نالی میں بُلبلا آ گیا ہو گا۔ ایسے ہوتا تو کم ہے لیکن کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔ بُلبلے میں ہوا ہوتی ہے۔ یہ خون میں چلا جائے تو دل تک پہنچ جاتا ہے اور دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ایسا امکان کم ہوتا ہے لیکن امکان موجود رہتا ہے۔ اسی لئے مریض کو لگا ہُوا گلوکوز بار بار دیکھا جاتا ہے۔"

"آپ نے ڈیوٹی نرس یا جو ملازم ڈیوٹی پر تھا اُس سے باز پُرس کی ہوگی؟"

"کی تھی" — اُس نے جواب دیا — "لیکن اپنی کوتاہی کون مانتا ہے؟ ایسی کوتاہی کا سراغ اور ثبوت بھی نہیں ملتا۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ اُس وقت ڈیوٹی پر کون سی نرس تھی۔ اُسی نے دیکھا تھا کہ مریضہ مری پڑی ہے اور گلوکوز رُکا ہُوا ہے۔ وہ کہتی تھی کہ ایک گھنٹہ پہلے اُس نے گلوکوز چیک کیا تھا۔ دراصل یہ نرس ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ مریضہ کے کمرے میں نہیں گئی تھی کیونکہ ایک ایمرجنسی کیس آگیا تھا۔ اسے ایک اور کمرے میں رکھا گیا تھا۔ مجھے بلایا گیا تھا۔ یہ نرس اس کے ساتھ مصروف رہی تھی۔ میں جلدی چلا گیا تھا۔ نرس کو میں کہہ گیا تھا کہ وہ اس کیس کا زیادہ خیال رکھے کیونکہ یہ خطرے میں ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب!" — میں نے کہا — "یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مریضہ کو زہریلی دوائی کا انجکشن دیا گیا ہے۔ زہر کے اثرات مرنے کے بعد چہرے کے رنگ سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ پوسٹمارٹم رپورٹ میں لکھا ہے کہ مُنہ کے کونوں پر جھاگ جمی ہوئی تھی۔ کیا آپ کے کسی ڈاکٹر یا لیڈی ڈاکٹر نے موت کی تصدیق کرنے کے لئے لاش دیکھی نہیں تھی؟"

"ہاں ہاں!" — ڈاکٹر نے جواب دیا — "لاش دیکھ کر ہی اُس نے موت کی تصدیق کی تھی لیکن اُس وقت زہر کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ اگر یہ کوئی زہر ہوتا (اُس نے دو تین زہروں کے نام لے کر کہا) تو ایک گھنٹے بلکہ اس سے بھی کم وقت میں چہرہ نیلا ہونا شروع ہو جاتا اور جھاگ اس سے پہلے مُنہ میں آجاتی۔ لیبارٹری ٹسٹ میں جو دوائی بتائی گئی ہے، اس کے اثرات زیادہ دیر بعد ظاہر ہوتے ہیں۔"

ہم نے اُس سے پوچھا کہ اُس کے اسسٹنٹ ڈاکٹر کیسے ہیں اور لیڈی ڈاکٹر کردار کے لحاظ سے کیسی ہے؟ اُس نے ان دونوں کے کردار

کی بہت تعریف کی۔ یہاں میں آپ کو ایک اور بات بتاتا ہوں۔ اُس زمانے میں میڈیکل کالجوں میں کوئی کوئی داخل ہوتا تھا۔ میڈیکل کالج امیروں اور بڑے لوگوں کے لئے جیسے ریزرو ہوتے تھے۔ آج کل تو میڈیکل کالجوں میں بھرمار ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر بے روزگار پھرتے ہیں۔ ویسے بھی یہ پیشہ بدنام ہو گیا ہے۔ اُس زمانے میں ڈاکٹری کا پیشہ اتنا باعزت سمجھا جاتا تھا کہ اعلیٰ حکام اور جرنیلوں کی محفل میں کوئی ڈاکٹر چلا جاتا تو سب تعظیم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اپنے پیشے میں ڈاکٹر مخلص اور دیانتدار ہوتے تھے۔ اُن میں خاندانی شرافت بھی ہوتی تھی۔

مقتولہ کے کمرے میں جو دو نرسیں اور دو ملازم باری باری دن رات جاتے تھے، اُن کے متعلق ڈاکٹر سے پوچھا۔ اُس نے سوائے ایک کے باقی سب کو اچھی رپورٹ دی۔ شعیب نام کا ایک ملازم ڈسپنسر تھا۔ کمروں میں اُس کی ڈیوٹی کم ہی لگا کرتی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس ڈسپنسر کی پہلے کچھ شکایتیں ملی ہیں کہ مریضوں سے رشوت لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس زمانے میں اس قسم کی رشوت کو بخشیش کہا جاتا تھا۔ اسے ٹپ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک سال پہلے اس نے ایک مریض کو غلط دوائی دے دی تھی۔ مریض مرتے مرتے بچا تھا۔ ڈاکٹر نے انکوائری کی تو پتہ چلا کہ اس نے مریض کے لواحقین سے پچاس روپے مانگے جو انہوں نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے نوکری سے برطرف کر دیا تھا لیکن دو ایسی سفارشیں اوپر سے پہنچ گئیں کہ ڈاکٹر مجبور ہو گیا اور یہ ڈسپنسر نوکری میں موجود رہا۔

ڈاکٹر کی یہ بات سُن کر مجھے قلق سا ہُوا۔ وہ اس لئے کہ یہ ڈسپنسر مسلمان تھا۔ ڈاکٹر نے ایک ہندو اور ایک کرسچین نرس کی اور دو ہندو ملازموں کی رپورٹیں تو صاف دیں لیکن شعیب واحد مسلمان ملازم تھا جس پر ڈاکٹر نے کرپشن کا الزام لگا دیا۔ یہ اب میں نے دیکھنا تھا کہ یہ مسلمان کیا واقعی ایسا تھا جیسا ڈاکٹر نے بتایا تھا؟

زہرِ عشق!

اس کے بعد ہم نے ایک چھوٹے ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر سے پوچھ گچھ کی۔ ان کے بولنے کے انداز سے ہم اندازہ لگانے کی کوشش کرتے رہے کہ یہ کہاں تک سچ بول رہے ہیں اور کیا یہ یا ان میں سے کوئی ایک اس واردات میں تو ملوث نہیں۔ مقتولہ کے کمرے میں زیادہ تر لیڈی ڈاکٹر جاتی تھی۔ وہ عیسائی تھی اور کسی بڑے ہی معزز خاندان کی خاتون لگتی تھی۔

بڑے ڈاکٹر کی طرح یہ بھی صحیح معنوں میں ڈاکٹر تھی۔ اُس کے بولنے کا انداز باوقار تھا۔ اُس میں متانت سی تھی جو بہت اچھی لگتی تھی۔ اُس کی عمر پینتیس چھتیس سال تھی۔

لیڈی ڈاکٹر نے مقتولہ کی بیماری اور موت کے متعلق وہی تفصیلات سنائیں جو بڑا ڈاکٹر سنا چکا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ آخری روز مریضہ کی حالت اتنی خراب نہیں تھی کہ وہ مر جاتی اور اتنی اچھی بھی نہیں تھی کہ اُسے ڈسچارج کر دیا جاتا۔ اس کا جگر بُری طرح متاثر ہو گیا تھا اسی لئے اُسے مسلسل گلوکوز دیا جا رہا تھا۔

"آپ کرسچن ہیں" — میں نے اُسے کہا — "مریضہ بھی کرسچن تھی۔ کیا آپ ان لوگوں کو جانتی تھیں؟"

"نہیں!" — اُس نے جواب دیا — "یہ لوگ میرے لئے اجنبی تھے"

"مریضہ کا خاوند آپ سے ملا ہوگا؟"

"ایک دو بار ملا تھا" — اُس نے کہا۔

"کیا کہتا تھا؟"

"اپنی بیوی کے متعلق پریشان تھا" — اُس نے جواب دیا — "پوچھتا تھا یہ ٹھیک ہو جائے گی؟ کب تک ٹھیک ہو جائے گی؟ .... میں اُسے تسلی دیتی اور کہتی تھی کہ ہیضے کا حملہ شدید تھا لیکن قابو میں آ گیا ہے۔

اس لیڈی ڈاکٹر سے ہمیں کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔

دوسرے ڈاکٹر سے پوچھ گچھ کی۔ اُس نے بھی ملتا جلتا بیان دیا۔

ہم نے اُس سے بھی پوچھا کہ وہ مقتولہ اور اُس کے خاوند کو پہلے جانتا تھا یا نہیں؟ اُس نے بھی جواب دیا کہ وہ انہیں نہیں جانتا تھا۔ میں نے اُس سے یہ بھی پوچھا کہ وہ عمران علی کو جانتا ہوگا۔ اُس نے جواب دیا کہ اُسے بھی وہ نہیں جانتا۔ مقتولہ کو مرا ہُوا ایک نرس نے دیکھا تھا جو قتل کی رات ڈیوٹی پر تھی۔ اُس نے اس ڈاکٹر کو اطلاع دی تھی۔ اُس رات یہ ڈاکٹر رات کی ڈیوٹی پر تھا اور ہسپتال کے ہی ایک کمرے میں سویا ہُوا تھا۔ اس نے آ کر لاش کو دیکھا اور موت کی تصدیق کر دی۔

"کیا آپ نے ضروری نہیں سمجھا تھا کہ ڈاکٹر انچارج کو اطلاع دے کر موت کی تصدیق کرائی جائے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "موت کی تصدیق کوئی بھی ڈاکٹر کر سکتا ہے۔ میں کالج سے نکلا ہُوا نیا ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔ آٹھ نو سال کا تجربہ ہے۔"

"کیا آپ نے محسوس نہیں کیا کہ مریضہ کو ہلاک کیا گیا ہے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "صاف پتہ چلتا تھا کہ مریضہ اس بیماری سے قدرتی موت مری ہے۔ اس کی بیماری خطرناک حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ یہ خطرے سے باہر تو تھی، لیکن بیماری کے اثرات خاصے گہرے تھے"

"آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ آپ کی مریضہ کو زہریلی دوائی کا انجکشن دیا گیا تھا" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ڈاکٹر نے یا ہسپتال کے کسی ملازم نے کیا ہوگا۔ کیا آپ ایسے کسی ملازم پر شک کا اظہار کر سکتے ہیں؟"

اُس نے سوچنا شروع کر دیا۔ پھر جس طرح وہ بولا اس سے مجھے شک ہُوا کہ یہ ٹال مٹول کر رہا ہے۔ میں نے ذرا اور سنجیدگی سے اور کچھ دبدبے سے پوچھا۔

"میں کسی پر بغیر ثبوت کے شک کا اظہار نہیں کر سکتا" ـــ اُس نے کہا ـــ "اگر آپ مجھ سے اُن ملازموں کی رپورٹ لیں جو ہسپتال کے اِس حصّے میں کام کرتے ہیں تو مَیں ایک ڈسپنسر کا نام لوں گا اور اس کا نام شعیب ہے۔ یہ شخص مجرمانہ شہرت کا آدمی ہے، لیکن میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ یہ اس واردات میں ملوث ہو سکتا ہے ... مجھے پتہ چلا ہے کہ مقتولہ کے خاوند پر شک کیا جا رہا ہے کہ اُس نے اپنی بیوی کو مروایا ہے۔ میں آپ کو ایک اشارہ دے سکتا ہوں۔ سراغرسانی آپ کا کام ہے۔ میں جب مریضہ کی موت کی اطلاع پر کمرے میں آیا تو کمرے میں مریضہ اکیلی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے اپنے رشتہ داروں میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے نرس سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اس کی ساس اس کے ساتھ رہتی تھی، لیکن آج شام کے بعد وہ گھر چلی گئی تھی۔ میں آپ کو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ مرتے وقت مریضہ اکیلی تھی۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہیں گے کہ نرس پر شبہ کیا جا سکتا ہے؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"نہیں" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "اس نرس کو میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی چھوٹا موٹا جرم ہوتا تو کسی پر بھی شک کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک انسان کو جان سے مار دینے کے لئے ایسی جرأت کی ضرورت ہے جو کم از کم اس نرس میں نہیں۔"

دوسرے ملازموں سے تفتیش کرنے سے پہلے ہم نے اس نرس کو بلایا۔ یہ بھی کرسچن تھی۔ اس سے ہم نے مریضہ کی بیماری کی تفصیلات پوچھیں۔ اُس نے وہی کچھ بتایا جو پہلے ہمیں معلوم ہو چکا تھا۔ علاج اور دیکھ بھال کی تفصیلات معلوم کیں۔ پھر اس نرس سے پوچھا کہ کبھی ایسا ہُوا ہے کہ وہ مقتولہ کے پاس بیٹھی ہو اور اُس نے اِس نرس کو اپنے خاوند کے متعلق کوئی بات بتائی ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ مقتولہ اتنی تکلیف میں تھی کہ اُس نے کبھی کوئی فالتو بات نہیں کی تھی۔

ہمارے پوچھنے پر اس نرس نے بتایا کہ یہ مقتولہ اور اس کے خاوند کو اس سے پہلے نہیں جانتی تھی۔ یہ نرس تیس سال کے لگ بھگ عمر کی شادی شدہ عورت تھی۔ چونکہ اس پر شبے کی گنجائش تھی اس لئے ہم نے اسے مشتبہ کی حیثیت دے کر تفتیش کی۔ یہ کوئی چالاک عورت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر انچارج ہمیں بتا چکا تھا کہ یہ نرس اُس رات ایک ایمرجنسی کیس میں مصروف ہو گئی تھی اور بہت دیر تک مقتولہ کے کمرے میں نہیں جا سکی تھی۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس رات مقتولہ کمرے میں اکیلی تھی۔

پوچھ گچھ کے دوران وہ سوچ میں گُم ہو گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا تو بھی وہ سوچ سے بیدار نہ ہوئی۔ مَیں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا تو وہ چونک پڑی۔

"میں معافی چاہتی ہوں" ـــ اُس نے کہا ـــ "مجھے کچھ یاد آ رہا تھا۔ پہلے میں نے اِدھر توجہ نہیں دی۔ اُس رات جو ایمرجنسی کیس آیا تھا، اُسے مقتولہ کے کمرے سے چھٹے کمرے میں رکھا گیا تھا۔ درمیان والے تمام کمرے خالی تھے۔ ڈاکٹر اس کیس میں مصروف تھا۔ مجھے ڈاکٹر نے ڈسپنسری سے کچھ لانے کو کہا۔ میں گئی اور وہ چیز لے آئی۔ میں جب اس ایمرجنسی مریض کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی تو دیکھا کہ ڈسپنسر شعیب مقتولہ کے کمرے سے نکل رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اُس رات ڈیوٹی پر تھا لیکن اس کمرے میں جانا اُس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ ویسے ہی اُس کمرے میں چلا گیا ہو گا۔ جتنے دن مریضہ وہاں رہی وہ شاید دو مرتبہ اس کمرے میں گیا ہو گا۔"

"وقت کیا تھا؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"ڈیڑھ بج چکا تھا" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "مَیں دو بجے کے بعد اُس کمرے میں گئی تو دیکھا کہ مریضہ مری ہوئی تھی۔ دو تین دنوں بعد سُنا کہ قتل کا شبہ اس مریضہ کے خاوند پر کیا جا رہا ہے تو مجھے اب یاد آ رہا ہے کہ میں نے

مریضہ کے خاوند کو دو مرتبہ اس ڈسپنسر کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا۔"

"کہاں؟"

"ایک بار برآمدے میں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "اور ایک بار ڈسپنسری کے باہر۔"

"کیا تم نے اُس سے پوچھا نہیں تھا کہ رات کو وہ اُس کمرے میں کیا کرنے گیا تھا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میں ایمرجنسی کیس کی تھکی ہوئی تھی پھر دیکھا کہ مریضہ مر گئی ہے تو مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔"

مریضہ کے کمرے میں کیوں گیا تھا؟

ڈسپنسر شعیب کو ہم سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں لے گئے اور اُسے انویسٹی گیشن روم میں بٹھا دیا۔ ہم نے تفتیش رات ڈیڑھ بجے سے کچھ بعد شروع کی۔ وہ چالیس سال سے اُوپر کی عمر کا تھا۔ اُس سے ہم نے پہلا سوال یہ کیا کہ جس رات مریضہ ڈیزی مری تھی اُس رات وہ اُس کے کمرے میں گیا تھا۔ رات ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ کیا اُس وقت مریضہ زندہ تھی؟

"میں اُس کے کمرے میں نہیں گیا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "اُس کے کمرے میں جانا میری ڈیوٹی میں شامل نہیں تھا۔"

"یاد کرو"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "اُس رات ڈیڑھ بجے تم کیا کر رہے تھے؟"

"میں ڈسپنسری میں ہوں گا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔"

"یہ تو تمہیں یاد ہو گا کہ مریضہ کا خاوند ڈینیل تمہارے ساتھ ایک روز برآمدے میں کھڑا باتیں کر رہا تھا"۔۔۔ میں نے کہا۔

"مجھے یاد نہیں"۔۔۔ اُس نے کہا۔

"دوسری بار ڈسپنسری کے دروازے پر تمہارے ساتھ کھڑا تھا"۔۔۔ میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کوئی دوائی لینے آیا ہو"۔۔۔ اُس نے کہا۔

"شعیب!"۔۔۔ میں نے اُس سے پوچھا ۔۔۔ "تمہارے بیوی بچے ہیں؟"

"ہیں صاحب!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "بیوی ہے۔ چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ دو بیٹیاں جوان ہیں۔"

"کیا ان پر تمہیں رحم نہیں آتا؟"

"انہی کی خاطر نوکری کر رہا ہوں صاحب!"۔۔۔ اُس نے کہا۔

"اور انہی کی خاطر جیل سے دُور رہنے کی کوشش کرو"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "بدبخت انسان! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ دو پولیس انسپکٹروں کو دھوکہ دے لو گے جن میں سے ایک انگریز ہے؟ تم نے ایک ہی بار چار پانچ جھوٹ بول ڈالے ہیں.... سچ بولو اور اس کا فائدہ ہم سے لو۔"

ہماری کوشش تھی کہ یہ شخص مان جاتے یا کوئی ایسا اشارہ دے دے جو یہ معمہ حل کر دے لیکن وہ بڑی ہی ڈھیٹ ہڈیوں کا بنا ہُوا تھا۔ میں اور ٹینیسن اُس سے جو بھی سوال کرتے تھے وہ اُلٹا ہی جواب دیتا تھا۔

یہ ایک خاص قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ جھوٹ میں انہیں روحانی تسکین ملتی ہے۔ ہم جب اُس کے رویّے سے تنگ آ گئے تو انسپکٹر ٹینیسن اُٹھا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اُٹھنے کو کہا۔ ٹینیسن نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم اسے اس کمرے سے اُس کمرے میں لے گئے جہاں پتھر بھی ٹوٹ جایا کرتے تھے۔

ایذا رسانی کے پہلے مرحلے میں ہی وہ بول پڑا۔ اُس کی حالت بہت بُری ہو گئی۔ ہم نے اُس پر تھرڈ ڈگری اس لئے آزمائی تھی کہ اُس نے خود ہی اپنے خلاف شک پکا کر دیا تھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اگر قتل کا یہ خود مجرم نہیں تو اسے یہ معلوم ہے کہ قاتل کون ہے۔ اُس کے سینے میں کوئی راز ضرور

تھا۔ وہ راز نکل آیا۔

اُس پر تو نیم غشی طاری تھی۔ اُس نے بیان دیا کہ اُس نے مقتولہ کو زہر کا انجکشن نہیں دیا تھا۔ وہ اُونگھتا، روتا اور قسمیں کھاتا تھا۔

"میں آپ کو تھوڑا سا اشارہ دے سکتا ہوں" — اُس نے اپنے بیان میں کہا — "مریضہ (ڈیزی) کے خاوند ڈینئیل کو میں پہلے روز خود ملا تھا۔ آپ نے کہا ہے کہ میں اُسے دوبارہ ملا تھا۔ میں اُسے اس سے زیادہ مرتبہ ملا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میری چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ دو بیٹیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ ان کی شادی کر سکوں۔ تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ میں انہیں روٹی کھلاؤں یا ان کی شادی کروں! میں مریضوں سے پیسے مانگتا رہتا ہوں۔ آؤٹ ڈور مریضوں میں سے دو چار سے کچھ پیسے مار لیتا ہوں۔ کمروں میں رہنے والے مریض امیر ہوتے ہیں۔ وقع پیدا کر کے ان سے بھی کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتا ہوں لیکن ہر کسی سے نہیں۔ ہر کوئی دیتا بھی نہیں ....

"اسی غرض سے میں پہلے روز ہی مسٹر ڈینئیل سے ملا تھا اور اُسے کہا تھا کہ میں اُس کی مسز کا خود بھی خیال رکھوں گا اور وہ دوائیاں بھی مہیا کروں گا جو بازار سے نہیں ملتیں اور دُودھ مکھن وغیرہ کا انتظام ہسپتال کے کھاتے سے ہی کر دیا کروں گا۔ مسٹر ڈینئیل نے مجھے تیس روپے دیئے۔ پھر مسٹر ڈینئیل میرے ساتھ فری ہو گیا تھا۔ اُس کی مسز کے مرنے سے ایک روز پہلے اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کسی کو تیز زہر دیا جائے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ وہ دراصل مذاق کے رنگ میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے دو تین زہروں کے نام بتا کر ان کے اثرات بتائے ....

"اُس نے پوچھا کہ کوئی ایسا زہر ہے جو کسی کو دیا جائے تو پتہ نہ چلے کہ اسے زہر دیا گیا ہے؟ میں نے اُسے بتایا کہ کچھ دوائیاں ایسی ہیں جو مکسچر میں دی جائیں تو فائدہ دیتی ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی دوائی زیادہ مقدار میں انجکشن کے ذریعے دی جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ

میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، میرا خیال ہے کہ ایسی دوائی سے پتہ نہیں چلتا کہ مرنے والے کو زہر دیا گیا ہے ....

"ہم دونوں برآمدے میں اُس کی مسز کے کمرے کے باہر کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے۔ وہ کمرے کے باہر اس لئے کھڑا تھا کہ اُس کی مسز کو بیڈ پر پیشاب وغیرہ کرایا جا رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے میرے ساتھ ڈسپنسری تک آ گیا۔ میں نے دوائیوں کی شیشیوں میں سے اُسے ایک شیشی دکھائی اور بتایا کہ اس دوائی کے چند قطرے دوسری دوائیوں کے مکسچر میں استعمال ہوتے ہیں لیکن یہ دوائی اکیلی انجکشن کے ذریعے دی جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے ....

"یہ چھوٹی سی شیشی تھی جو میں نے اسے دکھا کر وہیں شیشیوں میں رکھ دی۔ اُس وقت ایک چپڑاسی آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ مجھے دوائیوں کے سٹور میں بلایا گیا ہے۔ میں اُدھر چلا گیا۔ واپس آتے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ مسٹر ڈینئیل جا چکا تھا۔ شام کو جب چھٹی کا وقت ہو گیا تو ویسے ہی میری نظر دوائیوں کی شیشیوں پر پڑی۔ وہ شیشی وہاں نہیں تھی جس میں زہریلی دوائی تھی۔ دوسرے دن میں نے مسٹر ڈینئیل سے پوچھا تو اُس نے ہنس کر کہا کہ اُس نے اس دوائی کو کیا کرنا تھا۔ اُسی رات اس کی مسز مر گئی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتہ چلا کہ یہی دوائی انجکشن کے ذریعے دی گئی تھی۔"

میں یہ بھی بتا دوں کہ اُس دَور میں دوائیوں کے مکسچر استعمال ہوتے تھے۔ آج کل کی طرح نہیں تھا کہ ڈاکٹر دوائیاں لکھ دیتے ہیں جو بازار سے خریدنی پڑتی ہیں۔ پیٹنٹ دوائیاں بہت کم استعمال ہوتی تھیں۔ قصبوں میں تو پیٹنٹ دوائیاں ملتی ہی نہیں تھیں۔ انجکشن بہت ہی کم مریضوں کو لگتے تھے۔

"ڈسپنسری سے سرنج تو غائب نہیں تھی؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"سرنج؟" — ڈسپنسر شعیب نے حیران سا ہو کے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا — "ہاں، ایک سرنج کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

ڈسپنسری میں چار سرنجیں تھیں۔ میں نے دوسرے ڈسپنسر سے پوچھا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے معلوم نہیں۔

"ڈسپنسری کے انچارج اور ذمہ دار تم ہو یا دوسرا ڈسپنسر؟"

"میں ہی انچارج اور ذمّہ دار ہوں" —— اُس نے جواب دیا۔

"وہ کیسا آدمی ہے؟" —— مَیں نے پوچھا —— "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے سرنج کسی کو دے دی ہو؟"

"نہیں!" —— اُس نے جواب دیا —— "وہ اتنی جرأت نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد ہم نے اس شخص سے بہت ہی مغز مارا اور کھپایا۔ اُسے مزید تھرڈ ڈگری میں ڈالا، یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو گیا اور آدھے گھنٹے بعد ہوش میں آیا لیکن ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنے پہلے بیان پر قائم رہا۔ اُس نے اگر کوئی مزید ایک آدھ بات بتائی بھی تو اس سے ڈینئیل کے خلاف شک پختہ ہوتا گیا۔ میں آپ کو چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں سنا رہا۔ اس سے آپ کو بات ادھوری سی لگے گی۔ شکوک چھوٹی چھوٹی سی باتوں سے ہی پختہ ہُوا کرتے ہیں۔ ملزم یا مُشتبہ کو پتہ نہیں چلتا کہ اُس کے مُنہ سے کیا نکل گیا ہے۔ ہمیں اس پر یقین ہو چکا تھا کہ ڈسپنسر شعیب اس واردات میں ملوث ہے پھر ہمیں یہ شک ہو گیا کہ اسے مزید کچھ معلوم نہیں اور اس کے بیان کے مطابق قاتل ڈینئیل ہو سکتا ہے۔

کیا ڈیزی اُس وقت زندہ تھی؟

انسپکٹر ٹینیسن نے اس ڈسپنسر سے مزید پوچھ گچھ کی۔ میں اس کی گہری نظروں اور عقل کی باریکی کی داد دیتا ہوں۔ اُس نے کچھ باتیں ایسی پوچھی تھیں جو میرے ذہن میں نہیں آئی تھیں۔ میں نے اس قسم کے انگریز پولیس افسروں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ انسپکٹر ٹینیسن کی مزید پوچھ گچھ سے یہ واضح طور پر سامنے آ گیا کہ زہریلی دوائی اور سرنج ڈینئیل نے ڈسپنسری سے چوری کی تھی اور اپنی بیوی کو انجکشن کے ذریعے دی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ

اُس وقت مقتولہ سوتی ہوتی ہو گی اور ڈینئیل نے گلوکوز کی نالی میں بازو کے قریب دوائی انجیکٹ کی ہو گی۔

ہم نے دوسرے ڈسپنسر کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ ڈسپنسری میں سرنجیں کتنی تھیں جو زیرِ استعمال رہتی تھیں۔ اُس نے بتایا کہ چار سرنجیں ہیٹر پر رکھے ہوئے گرم پانی میں پڑی رہتی تھیں، ایک روز ایک سرنج کم تھی۔ اُس نے شعیب سے پوچھا تھا اور شعیب نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ سرنج ویسے بھی بیکار ہو گئی تھی۔ اس دوسرے ڈسپنسر کو جو ہندو تھا، ہم نے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا تھا۔ یہ ہمیں صاف نظر آتا تھا۔

ہم چونکہ منزل تک پہنچ گئے تھے اس لئے ایک منٹ کا آرام بھی اپنے اُوپر حرام کر لیا۔ اُس روز ڈینئیل سے جو زیرِ حراست تھا، پوچھا کہ وہ اقبالِ جرم کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اُس نے بڑی شدت سے انکار کیا۔ وہ اُچھل اُچھل کر اور میز اور اپنی ران پر ہاتھ مار مار کر کہتا تھا کہ اُسے اُس کے سُسر اور سالے کے جھوٹے بیانات پر قتل جیسے سنگین جُرم کا مجرم بنایا جا رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ انسپکٹر ٹینیسن ڈینئیل سے ایذا رسانی کے ذریعے اقبالی بیان لے گا لیکن اُس نے یہ فیصلہ سُنا کر کہ وہ اقبالی بیان نہیں لے گا مجھے حیران کر دیا۔ مجھے اپنے تجربے اور لمبی سروس پر اتنا بھروسہ اور اتنی خود اعتمادی تھی کہ میں اس انگریز انسپکٹر پر حاوی ہو جایا کرتا تھا لیکن میری اس کمزوری کا کوئی علاج نہیں تھا کہ میں ہندوستانی اور ٹینیسن انگریز تھا۔ اگر میرا عہدہ اس سے ایک درجہ اوپر بھی ہوتا تو بھی میں اُس کے حکم کا پابند تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈینئیل کے خلاف چالان زیرِ دفعہ ۳۰۲ تحریر کرے گا۔ اُس کے خیال میں ڈینئیل کے خلاف جو شہادت اکٹھی ہو گئی تھی وہ اسے سزا دلانے کے لئے کافی تھی لیکن میں اسے کافی نہیں سمجھتا تھا۔ یہ شہادت CIRCUM STANTIAL تھی جسے اُردو میں ہم واقعاتی

شہادت لکھا کرتے ہیں۔ ایسی شہادت اکثر اوقات عدالت میں ناکام ہو جایا کرتی ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے ٹھوس شہادت لازمی ہوتی ہے۔

انسپکٹر ٹینیسن کو بہرحال یقین تھا کہ وہ اسی شہادت پر ڈینیل کو سزا دلا سکتا ہے۔ میرے کہنے پر اُس نے یہ مان لیا کہ کچھ اور شہادت اکٹھی کر لی جاتے۔ ایسا کیا گیا۔ اس شہادت میں اہم صرف یہ بات تھی کہ ڈینیل کی ماں سے پوچھا گیا کہ قتل کی رات وہ کیا سوچ کر مریضہ کو اکیلی چھوڑ گئی اور گھر چلی گئی تھی۔

اُس نے بتایا کہ اُس شام ڈینیل نے اُسے کہا تھا کہ ماں، تم ہسپتال میں رہ رہ کر تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ ڈیزی پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔ تم آج رات گھر چلی جاؤ، میں نرس سے کہہ دوں گا کہ وہ ڈیزی کا خیال رکھے۔

ڈینیل کی ماں کے اس بیان سے ڈینیل کے خلاف شک مزید پختہ ہو گیا۔ اس شک کو یقین میں بدلنے کے لئے ایک اور شہادت کی ضرورت تھی وہ یہ کہ ہسپتال کے ایک یا دو آدمی یہ گواہی دے دیتے کہ انہوں نے قتل کی رات ڈینیل کو مقتولہ کے کمرے میں جاتے یا نکلتے یا کمروں کے برآمدے میں دیکھا تھا۔ ہم نے اپنے ذرائع سے یہ معلوم کرانے کی بہت کوشش کی لیکن ڈینیل کو ہسپتال کے تمام ملازم نہیں جانتے تھے۔ وہ ایک جرم کرنے ہسپتال گیا تھا اس لئے پوری طرح محتاط ہو کر گیا ہو گا۔ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا کہ اُسے ایسی شہادت کی ضرورت نہیں، وہ خانہ پُری کر لے گا۔

میں نے ایک بات واضح نہیں کی جو یہاں کر دیتا ہوں۔ میں نے سنایا تھا کہ ڈسپنسر شعیب کو قتل کی رات مریضہ کے کمرے سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔ میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا اُس نے کیا جواز پیش کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ ڈیزی کو دیکھنے گیا تھا کیونکہ ڈینیل اُسے کہہ گیا تھا کہ وہ ڈیزی کا ذرا خیال رکھے۔

"کیا ڈیزی اُس وقت زندہ تھی؟" — میں نے اُس سے پوچھا تھا۔

"زندہ تھی" — اُس نے جواب دیا تھا — "سوتی ہوئی تھی اور گلوکوز ٹھیک چل رہا تھا.... میں نے اُس سے پیسے لئے ہوتے تھے جو ایک قسم کی اُجرت تھی کہ میں یہ اپنی ڈیوٹی نہ سمجھتے ہوتے بھی اُس کا خیال رکھتا تھا۔"

اس ڈسپنسر کے متعلق میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا تھا۔ ہماری منت سماجت ہاتھ جوڑ جوڑ کر کرتا تھا۔ دو تین مرتبہ تو اُس نے میرے اور انسپکٹر ٹینیسن کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ وہ کہتا تھا کہ ہم اُس کی بیٹیوں پر رحم کریں۔ انسپکٹر ٹینیس نے اُسے کہا کہ اُس پر رحم کیا جائے گا بشرطیکہ وہ ہماری مرضی کے مطابق عدالت میں بیان دے۔ اُس نے وعدہ کیا کہ ہم اُس کا بیان اپنی ضرورت کے مطابق لکھ دیں اور مجسٹریٹ کے سامنے یہی بیان دے کر وہ دستخط کر دے گا۔

میں نے شاید اپنی کسی کہانی میں آپ کو بتایا ہے کہ جب کسی ملزم کے متعلق یقین ہو جاتا ہے کہ یہی اصل ملزم ہے لیکن شہادت کے ایک دو خانے خالی ہیں تو انہیں جھوٹے گواہوں سے پُر کر لیا جاتا ہے۔ پولیس کی زبان میں اسے پیڈنگ کہتے ہیں۔ انسپکٹر ٹینیسن بھی پیڈنگ کا سہارا لے رہا تھا لیکن میں اتنی زیادہ یا اس قسم کی پیڈنگ کا قائل نہیں تھا جو وہ کر رہا تھا۔ میں نے اُس کی مخالفت میں کچھ دلائل دیئے۔

"مسٹر ملک!" — اُس نے کہا — "یہ انڈیا ہے۔ تم نے خود دیکھا ہو گا کہ یہاں کے لوگ موٹی باتیں کرتے اور موٹی باتیں سمجھتے ہیں۔ تم انگلینڈ کی باتیں کر رہے ہو۔ یہ شخص ملزم ہے۔ اس آدمی اور غیر اہم سی ایک عورت کے قتل کو میں اتنی زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتا کہ دن رات اسی پر دماغ سوزی کرتے رہیں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ ہمارے پاس دو نہایت اہم کیس آئے ہوتے ہیں؟"

میں بال کی کھال اُتارنے کا عادی تھا۔ یہ عادت کبھی کبھی میری کمزوری بھی بن جایا کرتی تھی۔ میں نے اس انگریز انسپکٹر کی ہاں میں ہاں ملا دی لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ ڈینیئل کے خلاف یہ شہادت ملی تھی کہ اُس کی ماں نے کہا تھا کہ ڈینیئل نے دو تین مرتبہ ڈیزی کو مارا پیٹا بھی تھا لیکن ڈینیئل نے اس سے انکار کیا۔ وجنتی کے ساتھ اُس کی دوستی اور اُس کے ساتھ شادی کا ارادہ ظاہر ہو گیا تھا۔ ڈینیئل نے اس سے بھی انکار کیا تھا۔ عمران علی کا بیان بھی ڈینیئل کو ملزم ثابت کرتا تھا۔ اپنی ماں کو قتل کی رات گھر بھیج دینا بھی ڈینیئل کے ارادۂ قتل کو ثابت کرتا تھا۔ ڈینیئل کا ڈسپنسر شعیب سے ایسی دوائی کا پوچھنا جو زہر کا اثر کرے اور ظاہر نہ ہو کہ زہر دیا گیا ہے، ڈینیئل کے خلاف پختہ شک پیدا کرنے کے لئے کافی تھا۔ ڈسپنسری میں جا کر یہ دوائی دیکھنا اور پھر اس دوائی کی شیشی اور سرنج کا غائب ہو جانا بھی ڈینیئل کے خلاف جاتا تھا۔ ایسی ہی دو تین اور چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جو ڈینیئل کے خلاف جاتی تھیں۔

ہم نے یہ تمام شہادت ڈینیئل سے پوشیدہ رکھی اور اُس کے خلاف چالان تحریر کر دیا۔ ڈسپنسر شعیب کو یہ بیان دینے کے لئے کہا گیا کہ وہ اُس بیان کے علاوہ جو وہ ہمیں دے چکا ہے، یہ بھی کہے کہ اُس رات ڈیڑھ دو بجے کے درمیان ڈینیئل ہسپتال میں آیا تھا۔ ہم نے ایک اور آدمی کو یہ بیان دینے کے لئے تیار کر لیا کہ اُس نے قتل کی رات ڈینیئل کو مقتولہ کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔

یہ تو مقدمے کی تیاری کے مسئلے ہیں جن کی تفصیلات میں جانا اس لئے ضروری نہیں کہ بات لمبی ہو جائے گی اور آپ بوریت محسوس کریں گے۔ قصہ مختصر یہ کہ مقدمہ تیار کر کے عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ انسپکٹر ٹینیسن نے سب انسپکٹر دیوراج کے خلاف رپورٹ لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن میں نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ یہ اُس کا جذباتی معاملہ تھا۔ اُس کے اکلوتے بیٹے کی زندگی اور موت کا سوال تھا اس لئے اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ ہمیں ایسی کوئی شہادت نہیں ملی تھی کہ دیوراج نے کسی سے رشوت لے

کر تفتیش میں کوتاہی کی تھی۔ دیوراج میرے آگے رو پڑا تھا۔

کیس مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا۔ وکیلوں نے کوئی جرح نہ کی۔ جب کیس سیشن کورٹ میں گیا اور سماعت شروع ہوئی تو یہ بڑا ہی ہنگامہ خیز کیس بن گیا۔ وجنتی اور ڈسپنسر شعیب نے ہماری ضرورت کے مطابق بیان دیئے۔ ڈینیئل کی ماں سے بھی وہی باتیں کہلوا لی گئیں جو ڈینیئل پر الزام ثابت کرتی تھیں اور جن کے متعلق ہمیں شک تھا کہ وہ نہیں کہے گی۔ پبلک پراسیکیوٹر اپنے پیشے اور ذہنی لحاظ سے بڑا تیز اور ہوشیار آدمی تھا۔ بات کا بتنگڑ بنانا اور اُسے ثابت کرنا اُس کا کمال تھا۔ ہم نے کچھ اور شہادتیں بھی پیش کی تھیں۔ عمران علی کی گواہی نے بہت کام کیا تھا۔

سیشن جج ایک انگریز تھا۔ اُسے میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بڑا سخت آدمی تھا۔ یہ جان لیتا تھا کہ اس ملزم نے جرم کیا ہے پھر وہ شہادت کی باریکیوں میں نہیں جاتا تھا وہ دل میں سزا دینے کا فیصلہ کر لیتا تھا۔ اس کیس میں بھی اُس نے ایسے ہی کیا اور ڈینیئل کو عمر قید کی سزا سُنا دی۔

انسپکٹر ٹینیسن بہت خوش تھا کہ وہ کامیاب ہو گیا تھا لیکن میں نے اُسے کہا کہ ہائیکورٹ میں جا کر یہ سزا ختم ہو جائے گی کیونکہ ایسی ایک بھی شہادت نہیں تھی جو یہ ثابت کرتی کہ ڈینیئل کو اپنی بیوی کو انجکشن لگاتے دیکھا گیا ہے۔ یہ بھی ثابت نہیں ہُوا تھا کہ زہریلی دوائی شیشی اور سرنج ڈینیئل نے چوری کی تھی۔ سیشن جج نے جو فیصلہ لکھا تھا اُس میں بھی دو تین کمزوریاں تھیں چنانچہ میرا کہنا صحیح ثابت ہُوا۔ اپیل دِلّی کے ایک بڑے ہی قابل اینگلو انڈین بیرسٹر نے دائر کی اور انہی نکات پر اپیل منظور کروا لی جو میں نے بیان کئے ہیں۔ ڈینیئل شک کے فائدے پر بری ہو گیا۔

ہم پھر بھی خوش تھے کہ سیشن کورٹ نے ہمارا مقدمہ مضبوط سمجھتے ہوئے ملزم کو سزا دے دی تھی۔ ہائیکورٹ سے تو بڑے سنگین کیس بھی بری ہو جاتے ہیں۔ ہمارا دردِ سر ختم ہو گیا تھا لیکن ڈیڑھ دو مہینے بعد ہی اس کیس سے ایک اور انتہائی سنگین واردات نے جنم لیا اور میں اور

انسپکٹر ٹینیسن ایک بار پھر تفتیش اور ملزموں کے تعاقب میں ہلکان ہونے لگے۔

ہائی کورٹ نے ڈینیل کی اپیل منظور کرتے ہوئے اُسے شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا تو میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ ہائی کورٹ میں جا کر ہمارا کیس ناکام ہو جائے گا، لیکن انسپکٹر ٹینیسن کے ہاتھوں میں ایسا مجبور تھا کہ تفتیش کو مزید آگے نہ چلا سکا۔ میرے تیار کئے ہوئے مقدمے اس طرح ہائی کورٹ میں جا کر برباد نہیں ہوا کرتے تھے، لیکن انسپکٹر ٹینیسن صرف اتنی سی بات پر مطمئن تھا کہ اُس نے ایک کیس سے نجات حاصل کر لی ہے اور سیشن کورٹ نے ملزم کو سزا دے دی ہے۔ آخر خدا نے میری سُن لی اور اسی کیس کے اہم کردار ایک بار پھر میرے سامنے آ گئے۔

ہائی کورٹ نے جس روز ڈینیل کی اپیل منظور کرتے ہوئے اُسے بری کر دیا، اس کے آٹھ دس دنوں بعد دِلّی کے ایک اُردو اخبار میں ایک خبر چھپی جو اس طرح تھی کہ گذشتہ رات گیارہ بجے کے درمیان نئی دِلّی کی سڑک پر ایک سائیکل سوار جا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک کار آئی جس نے سائیکل سوار کو ٹکر ماری۔ کار والا رُکے بغیر کار کو بھگا لے گیا۔ کچھ دُور پیچھے ایک فوجی جیپ آ رہی تھی جس میں انگریز فوجی سوار تھے۔ جیپ زخمی کے پاس رُکی۔ دو فوجی اُترے۔ جیپ ایک گورا لیفٹیننٹ چلا رہا تھا۔ دو فوجی اس کے ساتھ بیٹھے رہے۔ گورے لیفٹیننٹ نے جیپ کار کے پیچھے دوڑا دی۔ کار والا شہر کی طرف آنے کی بجائے غیر آباد علاقے کی طرف جانے والی سڑک پر کار لے گیا۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے ایک فوجی نے کار کا ایک پہیہ پنکچر کرنے کے لئے رائفل کے دو تین راؤنڈ فائر کئے۔ کار رُک گئی۔ اس میں سے ایک آدمی باہر نکلا اور سڑک کے اُس طرف دوڑتا ہوا نکل گیا جدھر درخت بھی تھے اور زمین کٹی پھٹی تھی۔ فوجیوں نے جیپ کا مُنہ اُس طرف کر کے چند اور راؤنڈ چلائے۔ وہ شخص جیپ کی روشنی سے اور رائفلوں کی زد سے نکل گیا۔ آگے علاقہ ایسا تھا جہاں جیپ نہیں جا سکتی تھی۔

زخمی کے پاس جو دو فوجی اُترے تھے، اُنہوں نے زخمی کو ہسپتال پہنچایا۔ معلوم ہُوا کہ مضروب اسی ہسپتال کا ڈسپنسر ہے ۔۔۔ اس کا نام خبر میں شعیب لکھا تھا۔

یہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کی نئی دِلّی کا واقعہ ہے جب شہر کے باہر کے علاقے غیر آباد تھے بلکہ شہر کے اندر بھی کچھ علاقوں میں آبادی نہیں تھی۔ اب تو وہاں ایک انچ جگہ بھی خالی نہیں ہو گی۔ آبادی کا وہی حال ہو گا جو ہمارے بڑے شہروں کا ہے۔ میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس وقت کاریں اس افراط سے نہیں ہوتی تھیں جتنی آج ہیں۔ بڑے بڑے امیر لوگ کاریں رکھتے تھے۔ انگریز فوجی افسروں کے پاس بھی کاریں نہیں ہوتی تھیں۔

میں نے یہ خبر پڑھی تو اپنے ساتھی انگریز پولیس انسپکٹر ٹینیسن کو سنائی۔ اُس کے سامنے ہندوستان کا مشہور انگریزی اخبار "سٹیٹسمین" پڑا تھا۔ اُس نے یہ خبر اس اخبار میں بھی تلاش کر لی۔

"انسپکٹر ٹینیسن!" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "یہ وہی ڈسپنسر شعیب ہے جس سے تم نے آدھی سچی اور آدھی جھوٹی گواہی دلوائی تھی۔ میں آج بھی کہتا ہوں کہ مقتولہ ڈیزی کو زہریلی دوائی کا انجکشن اسی کے ہاتھوں دلوایا گیا تھا۔ خبر میں لکھا ہے کہ ہسپتال میں اس کی حالت تشویشناک ہے۔ اس سے میرا شک پختہ ہوتا ہے کہ قاتل یہی تھا اور خدا نے اسے سزا دے دی ہے .... اُردو زبان کا ایک محاورہ ہے کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے" ۔۔۔ میں نے اُسے محاورہ اُردو زبان میں سنایا۔

"میں نہیں مانتا" ۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے مُسکراتے ہوئے کہا ۔۔۔ "خدا کی یہ لاٹھی بے آواز نہیں تھی۔ کار نے جب سائیکل کو ٹکر ماری تھی تو اتنی زور کی آواز پیدا ہوتی ہو گی جو دُور دُور تک سنائی دی ہو گی .... بھولو اسے۔ جو ہُوا اچھا ہو گیا۔"

اگلی صبح دفتر پہنچے۔ اردو اور انگریزی اخبار ہم سے پہلے دفتر میں

پہنچ چکے تھے۔ انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے بتایا کہ اس ایکسیڈنٹ کی خبر آج پھر آئی ہے۔ اُس نے "سٹیٹسمین" سے یہ خبر پڑھ کر مجھے سنائی جو مختصراً یہ تھی کہ شعیب ہسپتال میں ابھی تک بے ہوش پڑا ہے اور وہ بدستور خطرے میں ہے۔

خبر کا یہ حصہ ہمارے لئے ذرا سا بھی اہم نہیں تھا، لیکن اس خبر کے اگلے حصے نے مجھے چونکا دیا۔ لکھا تھا کہ شعیب کو ٹکر مارنے والی کار کے متعلق جسے اس کا ڈرائیور تعاقب سے بچنے کے لئے ویران علاقے میں چھوڑ گیا اور خود رُوپوش ہو گیا تھا، پولیس نے معلوم کر لیا ہے کہ یہ ایک ملٹری کنٹریکٹر عمران علی کی ہے۔ اس وقت کار پولیس کے قبضے میں ہے۔

خبر کے آخر میں لکھا تھا کہ پولیس نے کار کی رجسٹریشن پر عمران علی کا ایڈریس دیکھا اور اُسے جا پکڑا۔ معلوم ہُوا کہ اُس نے علی الصبح اپنے علاقے کے تھانے میں یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ رات کو اُس کی کار کوٹھی سے چوری ہو گئی ہے۔

"انسپکٹر ٹینیسن!" — میں نے کچھ سنجیدہ سا ہو کر کہا — "یہ ڈیزی کے قتل کے دو کردار ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ڈرامہ ابھی تک چل رہا ہو؟"

انسپکٹر ٹینیسن نے اُکتاہٹ اور بے رُخی سے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ ذہن سے اُتارو اُس کیس کو۔

"معلوم ہوتا ہے سٹرلک، تم ابھی تک اُسی کیس کی دلدل میں پھنسے ہوتے ہو" — ٹینیسن نے کہا۔

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اُس کیس کو جو کورٹوں سے ہو کر فائلوں میں دفن ہو جاتے، اُسے پولیس والے ذہن سے اُتار دیا کرتے ہیں۔ اصول بھی یہی ہوتا تھا۔ اُس وقت ہمارے پاس چند اور کیس تھے۔ ہمیں مرے

ہوتے کیس کا مُردہ نہیں اُکھاڑنا چاہیئے تھا۔

سات آٹھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ یہ مُردہ خود ہی قبر سے اُٹھ کر ہمارے دفتر میں آ گیا۔ پہلے کی طرح اب بھی ہمارے باس ڈی ایس پی میڈیوز نے مجھے اور انسپکٹر ٹینیسن کو اپنے دفتر میں بلایا اور مُسکراتے ہوئے وہی الفاظ کہے جو میں انسپکٹر ٹینیسن سے کہہ چکا تھا۔ اس کیس کے متعلق اُس نے ہمیں کچھ باتیں بتائیں۔

"بظاہر یہ ایک کار کی چوری کا کیس ہے" — ڈی ایس پی میڈیوز نے کہا — "اور دوسری طرف چھوٹے سے ایک حادثے کا کیس ہے کہ ایک کار نے ایک سائیکل کو ٹکر ماری اور سائیکل سوار اتنا مضروب ہُوا کہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔ تم دونوں شاید جانتے بھی نہیں ہو گے کہ یہ حادثہ ہُوا ہے۔"

"ہم نے اخباروں میں اس کی دو خبریں پڑھی تھیں" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "اور ہم دونوں نے اس حادثے کو صرف اس لئے اہم سمجھا تھا کہ اس میں اُس کرسچن لڑکی کے قتل کے کیس سے متعلق دو اشخاص کا نام آتا تھا جو ہسپتال میں زہر خورانی سے مر گئی تھی۔"

"میرا اور ڈی ایس پی کلارک کا خیال یہ ہے" — میڈیوز نے کہا — "کہ اس کیس کی اہمیت اس سے زیادہ ہے جو تم دونوں سمجھ رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس کرسچن لڑکی کے قتل کے کیس کی ہی ایک کڑی ہے۔ تم اسے اُسی ڈرامے کا اگلا سین کہہ سکتے ہو۔"

ڈی ایس پی میڈیوز نے ہمیں اس کیس کے متعلق طویل گفتگو میں جو بتایا اُس کا لبِ لباب یہ تھا کہ ڈی ایس پی کلارک اُس علاقے کا ڈی ایس پی تھا جس علاقے کے تھانے میں عمران علی نے اپنی کار کی چوری کی رپورٹ لکھوائی تھی اور وہ تھانہ کار کی تلاش اور تفتیش میں مصروف تھا۔ ڈی ایس پی کلارک کو اُس تھانے کے ایس ایچ او سب انسپکٹر جلال الدین افغانی نے

کار کی چوری کے متعلق کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جن سے یہ شک پیدا ہوتا تھا کہ کار چوری نہیں ہوئی اور یہ معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔ سب انسپکٹر افغانی نے اپنے شکوک اپنے ڈی ایس پی کلارک کو تفصیلاً بتائے تھے۔

میں آپ کو سب انسپکٹر افغانی کے شکوک کی تفصیلات آگے چل کر سناؤں گا۔ انہی سے یہ کہانی ایک ڈرامے کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

ڈی ایس پی کلارک کسی تقریب یا پارٹی میں ہمارے ڈی ایس پی میڈیوز سے ملا اور اُس نے ہمارے ڈی ایس پی کو کار کی چوری اور ایکسیڈنٹ کے کیس سنائے۔ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ عمران علی اور مضروب ڈسپنسر شعیب کرسچن لڑکی کے قتل کے کیس میں مشتبہ تھے پھر انہیں استغاثہ کے گواہ بنا لیا گیا تھا۔

ہمارے یعنی سی آئی اے کے ڈی ایس پی میڈیوز نے اُسے کرسچن لڑکی کے قتل کا واقعہ اور ہماری تفتیش سنائی۔ دونوں ڈی ایس پی آپس کے صلاح مشورے سے اس رائے پر پہنچے کہ یہ کیس سی آئی اے کے پاس آنا چاہیئے۔ چونکہ عمران علی کے تعلقات، پاک یا ناپاک، مقتولہ کے ساتھ تھے اور شعیب کا بھی اُس کیس کے ساتھ گہرا تعلق تھا اس لئے یہ شک کیا جا سکتا تھا کہ شعیب کو عمران علی نے دانستہ ٹکر ماری اور اُس کا ارادہ شعیب کو جان سے مار دینے کا تھا۔

میرے نزدیک یہ شک کچھ کمزور تھا۔ اس لئے کہ عمران علی جیسا دولت مند آدمی اگر کسی بھی وجہ سے غریب سے ایک ڈسپنسر کو قتل کرنا چاہتا تو آسانی سے کروا سکتا تھا۔ وہ اتنا بیوقوف نہیں ہو سکتا تھا کہ اُسے یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ سائیکل کو ٹکر مارنے سے کار پر بھی ڈینٹ پڑ جائیں گے جن سے وہ پکڑا بھی جا سکتا ہے۔ شک مجھے بھی کچھ ایسا ہی تھا، لیکن پولیس کے یہ دونوں انگریز ڈی ایس پی اپنے ذہن میں کچھ اور رکھے ہوتے تھے۔

وہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ میں نے اس کہانی کے آغاز میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ اُس وقت ہندوستان میں جاپان کے جاسوس پھیلے

ہوئے تھے۔ ان میں جرمنی کے جاسوس بھی تھے۔ انگریزوں کو یہ خطرہ صاف نظر آ رہا تھا کہ جاپانی فوجیں ہندوستان پر بھی یلغار کریں گی۔ اُس وقت ہندوستان کا پڑوسی ملک برما جاپانیوں کے قبضے میں تھا اور جاپان کے بمبار طیاروں نے کلکتہ کی بندرگاہ پر بھی بمباری شروع کر دی تھی۔

جاسوسوں سے تو ہر ملک ڈرتا ہے، لیکن انگریز جاپان اور جرمنی کے جاسوسوں سے زیادہ ہی خوفزدہ تھے۔ اس خوفزدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جاپان کے جاسوس جو ہندوستان کے ہی باشندے تھے، جاسوسی اور تخریب کاری میں خصوصی مہارت اور ذہانت رکھتے تھے۔ ہندوستان میں انگریز اتنا محتاط ہو گیا تھا کہ رات کو شہروں اور قصبوں میں پولیس گشت کرتی رہتی تھی۔ کسی پر ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو اُسے تھانے لے جاتے اور پوری تسلی کر کے اُسے چھوڑتے تھے۔ ڈی ایس پی میڈیوز اور ڈی ایس پی کلارک کو یہی شک تھا کہ یہ جاسوسی کا ہی کھیل ہو گا۔ اس سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے سی آئی اے نے اس سے ملتے جلتے دو کیس تفتیش کئے تھے۔ یہ دونوں بظاہر دوسرے جرائم کی وارداتیں تھیں، لیکن تفتیش کے دوران پتہ چلا کہ یہ جاسوسی اور تخریب کاری کے کیس ہیں۔

ڈیزی کے قتل کے سلسلے میں جو اشخاص ہمارے سامنے آئے تھے، ان سب کا تعلق مسلح افواج کے ساتھ تھا۔ مقتولہ ایئر ہیڈ کوارٹر میں ایئر فورس کے ایک بڑے انگریز افسر کی سٹینو تھی۔ اس کا خاوند ڈینیل جو اس کے قتل کا ملزم تھا، جی ایچ کیو میں بڑے اچھے عہدے پر ملازم تھا اور عمران علی ملٹری کنٹریکٹر تھا اور اُس وقت اُس کے پاس ایئر فورس کے ایک دو ٹھیکے تھے۔ اس کیس میں ایک مشتبہ ہندو لڑکی وجنتی بھی تھی جس کا باپ کانگریس کا لیڈر تھا اور لڑکی سوشل اور پولیٹیکل ورکر تھی اور وہ گریجویٹ بھی تھی۔ وجنتی کا دوستانہ قتل کے ملزم ڈینیل سے تھا۔

ہمارے ڈی ایس پی نے مجھے اور انسپکٹر ٹینیسن کو بڑی واضح اور طویل بریفنگ دی تھی جو مکمل طور پر سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتا رہا

ہوں کہ اس کیس کا سی آئی اے کے پاس آنا بلاجواز نہ تھا۔

کار کی چوری مشکوک تھی

میں اور انسپکٹر ٹینیسن یہ کیس لیتے ہی سب سے پہلے ہسپتال میں گئے۔ ڈیزی کے قتل کی تفتیش کے لئے ہم ہسپتال میں نہ صرف آچکے تھے بلکہ کئی بار آکر اس سے بڑی اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ ہم ڈاکٹر سے ملے اور ہمارے کہنے پر وہ ہمیں اُس کمرے میں لے گیا جہاں شعیب کو رکھا گیا تھا۔ وہ چونکہ اسی ہسپتال کا ڈسپنسر تھا اس لئے اُسے یہ اعزاز دیا گیا کہ الگ کمرے میں رکھا گیا۔ اُس پر ابھی تک غشی طاری تھی۔

ڈاکٹر نے ہمیں اُس کے زخموں اور چوٹوں کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ بریں ہیمرج نہیں جس سے امید بندھتی ہے کہ یہ ہوش میں آجائے گا۔ اُس کے ایک بازو کی کہنی کے نیچے سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ایک ٹانگ کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹی تھی۔ پسلیوں پر بہت بُرا دباؤ پڑا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی بھی مضروب تھی۔ پیٹھ اور ایک ران پر زخم بھی تھے۔

"کیا یہ کبھی بیان دینے کے قابل ہو گا؟" — میں نے پوچھا — یا اسی حالت میں ...."

"ہم اسے واپس لانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں" — ڈاکٹر نے کہا — "ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"ایک انتظام کریں ڈاکٹر صاحب!" — میں نے کہا — "آپ کا کوئی آدمی یا نرس یا کوئی اور ملازم ہر وقت اس کمرے میں موجود رہے۔ جونہی یہ ہوش میں آئے یا غشی میں کچھ بڑبڑائے تو آپ کو فوراً اطلاع دی جائے اور آپ فوراً پہنچیں اور سُنیں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اگر اس میں کچھ کہنے کی طاقت آجائے تو اس کا بیان لے لیں۔ اگر آپ سمجھیں کہ ہم بروقت پہنچ سکتے ہیں تو ہمیں فون کر دیں۔ دن ہو یا رات، آپ کا پہنچنا لازمی ہے۔"

ڈاکٹر سمجھ گیا کہ ہم نزعی بیان لینا چاہتے ہیں۔ اُس نے ایسے کئی

بیان لئے بھی ہوں گے۔ ہمارے کہنے پر ڈاکٹر نے بتایا کہ حادثے کی رات شعیب رات دس بجے کے کچھ بعد ڈیوٹی سے فارغ ہُوا تھا۔ وہ سائیکل پر آیا جایا کرتا تھا۔ ہم نے ہسپتال میں کوئی باقاعدہ تفتیش نہ کی۔ صرف یہ دیکھنے گئے تھے کہ مضروب ہوش میں آیا ہے یا نہیں اور اُس کی جسمانی حالت کیسی ہے۔ وہاں سے ہم اُس تھانے میں گئے جہاں عمران علی نے اپنی کار کی چوری کی رپورٹ دی تھی۔ اس تھانے کے ایس ایچ او نے جو تفتیش کی تھی وہ اس کی فائل میں موجود تھی اور فائل ہمارے پاس تھی۔ یہ ہمارے ڈی ایس پی نے دو روز پہلے منگوالی تھی۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس تھانے کا ایس ایچ او آگرہ کا رہنے والا سب انسپکٹر جلال الدین افغانی تھا۔ اس کے متعلق ایک دو باتیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ احمد شاہ ابدالی کی فوج کے کسی جرنیل کی اولاد سے تھا۔ یہ جرنیل پانی پت کی تیسری لڑائی میں ہندوستان میں آیا تھا۔ فتح کے بعد یہیں رہا اور آگرہ میں آباد ہو گیا۔ اُس کی نسل آج بھی آگرہ میں آباد ہے۔ سب انسپکٹر افغانی اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بعض لوگ اپنا شجرۂ نسب مغلیہ خاندان اور ایسے ہی بادشاہوں سے جا ملایا کرتے ہیں لیکن اُن کے کردار اور سلوک وغیرہ سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ شجرۂ نسب کہاں تک صحیح ہے۔ سب انسپکٹر جلال الدین افغانی اگر اپنا شجرۂ نسب نہ بتاتا تو بھی سب کہتے کہ یہ کسی بڑے ہی باوقار اور معزز خاندان کا آدمی ہے۔ بڑے بلند کردار کا سب انسپکٹر تھا، اپنی ڈیوٹی میں مخلص اور دیانتدار اور اصل خوبی یہ کہ بھوکا نہیں تھا۔

ہم اس کے پاس گئے۔ فائل پر تو مختصر سی ضمنیاں لکھی جاتی ہیں۔ بیان بھی مختصر ہوتے ہیں۔ ہم نے سب انسپکٹر افغانی سے کہا کہ وہ زبانی ہمیں بتائے کہ یہ کیا قصہ ہے اور اُس نے کیا رائے قائم کی ہے۔ اُس نے پوری دیانتداری سے تفتیش کی تھی۔ ظاہری طور پر تو یہ ایک کار کی چوری کی واردات تھی۔ اُس زمانے میں کاریں کم تھیں اس لئے کاروں

کی چوری بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ آج کل کاروں کا کوئی شمار ہی نہیں اور کار چوری کی وارداتیں ہر روز اور ہر شہر میں ہوتی ہیں۔ اُس وقت کار چوری بھی ایک بڑی واردات تھی۔ کبھی کبھار کسی تھانے میں ایسی رپورٹ آجاتی تو تھانیدار کار کی تلاش میں ہلکان ہونے لگتا تھا اور اس سلسلے میں جو کارروائی ٹریننگ کی کتابوں میں لکھی ہوتی تھی وہ شروع کر دی جاتی تھی، لیکن افغانی نے معمول کا یعنی رُوٹین کا یہ طریقہ اختیار نہ کیا بلکہ ذہن میں کوئی شک بٹھا کر تفتیش شروع کی۔

یہاں میں پھر وہ بات کہوں گا جو پہلے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ انگریز اپنے قانون کا احترام کرتے ہیں۔ اسی کیس میں دیکھ لیں کہ دو ڈی ایس پی اکٹھے ہوتے، انہوں نے معمولی سے دو کیسوں کو اکٹھا کر کے خود ہی فیصلہ کیا کہ اس کیس کی تفتیش سی آئی اے کو کرنی چاہیئے، حالانکہ وہ کسی پارٹی میں اکٹھے ہوتے تھے جہاں اُنہیں گپ شپ لگانی چاہیئے تھی۔ انگریز تو اپنی پارٹیوں میں شراب بھی پیتے تھے، لیکن یہ دو ڈی ایس پی اپنے فرائض کو نہ بھولے۔

سب انسپکٹر افغانی کار کی چوری کی تفتیش اور تلاش کو عام لائن پر ڈال دیتا لیکن اُسے تھوڑا سا علم تھا کہ چند مہینے پہلے ہسپتال میں ایک کرسچن لڑکی قتل ہو گئی تھی اور مسروقہ کار کا مالک اور حادثے کا مضروب دونوں اُس قتل کے کیس کے اہم گواہ تھے۔ افغانی نے قتل کی واردات والے تھانے کے ایس ایچ او سب انسپکٹر دیوراج سے ٹیلی فون پر اُس کیس کی تفصیلات معلوم کیں۔ اُس کے ساتھ تبادلۂ خیالات بھی کیا۔ اس کے بعد اس نے کار کے پیچھے دوڑنے کی بجائے تفتیش شروع کر دی۔

یہاں صورت اس طرح مختلف ہو گئی کہ کار اگلے ہی روز مل گئی جسے عمران علی نے شناخت کیا۔ اس کی رجسٹریشن اُسی کے نام پر تھی۔ اب مسئلہ یہ رہ گیا تھا کہ یہ کار عمران علی کی کوٹھی سے کون نکال کر لے گیا تھا۔ سب انسپکٹر افغانی بڑی آسانی سے عمران علی کو راضی کر سکتا تھا کہ وہ

اپنی کار لے جائے اور یہ تحریر دے دے کہ وہ اپنی رپورٹ اپنی مرضی سے واپس لے رہا ہے۔ افغانی نے ہمیں بتایا کہ عمران علی کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رپورٹ واپس لینے پر آمادہ ہے یا آسانی سے آمادہ ہو جائے گا، لیکن سب انسپکٹر افغانی یہ کیس یہیں پر ختم کرنے پر آمادہ نہ ہُوا۔ یہ اُس کے تھانے کا علاقہ تھا۔ ایسی اور وارداتیں بھی ہو سکتی تھیں۔ وہ پبلک کو یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ اُن کے جان و مال کے محافظ موجود ہیں۔

افغانی کو مخبروں نے بتایا تھا کہ عمران علی شرابی کبابی آدمی ہے۔ اُن دنوں اُس کی بیوی اپنے ماں باپ کے ہاں گئی ہوتی تھی۔ اُس کا ایک ہی بچہ تھا جو اپنی ماں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ عمران علی کا باپ وہاں سے کچھ دُور ایک اور کوٹھی میں رہتا تھا۔ ٹھیکیداری کی بدولت یہ لوگ اچھے خاصے دولت مند تھے۔ سب انسپکٹر افغانی نے اپنی ساری تفتیش زبانی سُنا کر یہ رائے دی کہ کار کی چوری مشکوک نظر آتی ہے۔

میں آپ کو یہ بتا چکا ہوں کہ سی آئی اے کو نہ کار کے ساتھ دلچسپی تھی نہ کار چور کے ساتھ۔ ہمیں کچھ اور ہدایات ملی تھیں۔ ہم نے اپنی تفتیش شروع کر دی۔ سب انسپکٹر افغانی نے ہماری رہنمائی اور مدد پورے خلوص کے ساتھ کی۔

رات دس بجے کا راز

سب سے پہلے عمران علی کو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا۔ وہ اڑھائی تین گھنٹوں بعد ہمارے پاس پہنچا۔ اُسے بٹھا کر میں اور انسپکٹر ٹینین اُس کے سامنے بیٹھ گئے اور اُس سے پوچھا کہ کار کہاں سے اور کس وقت چوری ہوئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ کار کوٹھی کے اندر گیراج میں کھڑی تھی۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے نوکر نے اُسے بتایا کہ گاڑی گیراج

میں نہیں ہے۔ اس نے جاکر دیکھا۔ گاڑی وہاں نہیں تھی۔

"رات کتنے بجے گاڑی گیراج میں رکھی گئی تھی؟"

"دس بجے" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "میں باہر سے آیا۔ نوکر نے گیٹ کھولا اور میں سیدھا گاڑی گیراج میں لے گیا اور گاڑی کے دروازے لاک کر دیئے۔"

"کیا گیراج کے دروازے کو تالا لگایا تھا؟"

"گیراج بغیر دروازے کے ہے" ـــ عمران علی نے جواب دیا۔

"گاڑی کی چابی کہاں رکھی تھی؟"

"وہ تو میرے پاس ہے" ـــ عمران علی نے جواب دیا ـــ "ظاہر ہے کہ جعلی چابی سے گاڑی کھولی اور سٹارٹ کی گئی۔"

ہمارے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں ایک خانساماں اور ایک نوکر رہتا ہے۔ خانسامے کی بیوی اور دو بچے بھی وہاں رہتے تھے۔ ہم نے عمران علی سے پوچھا کہ یہ ملازم قابلِ اعتماد ہیں یا نہیں۔ اُس نے دونوں کے اخلاق کی بہت تعریف کی۔

"آپ رات دس بجے کہاں سے آئے تھے؟"

اُس نے ایک دوست کا نام بتا کر کہا کہ وہ اُس کے پاس گیا تھا۔ ہم نے اس دوست کا ایڈریس اور فون نمبر لکھ لیا۔ عمران علی نے بتایا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے اس دوست کے ہاں رہا تھا۔ کھانا بھی وہیں کھایا تھا۔

"عمران علی!" ـــ انسپکٹر ٹینیسن نے اُس سے پوچھا ـــ "تمہاری کار نے ایک سائیکل سوار کو ٹکر ماری ہے۔ معلوم نہیں وہ آدمی زندہ رہتا ہے یا نہیں۔ اگر یُوں ہُوا ہو کہ تمہاری کار کوئی دوست لے گیا ہو اور یہ حادثہ کر کے بھاگ اُٹھا ہو تو ہمیں ابھی بتا دو۔ یہ کوئی اتنا سنگین جرم نہیں۔ ہم تمہیں موقع دیتے ہیں کہ اپنے دوست کو بچانے کی بجائے اپنا دفاع کرو۔ اگر تم نے میری بات سمجھنے کی کوشش نہ کی تو یہ معاملہ سنگین بھی ہو سکتا ہے۔"

اُس نے واضح الفاظ میں بتایا کہ اُس نے اپنی گاڑی کسی دوست کو نہیں دی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ گاڑی کوٹھی سے چوری ہوئی۔

اُسے ساتھ لے کر ہم اُس کی کوٹھی میں چلے گئے۔

سب سے پہلے یہ دیکھا کہ گیراج کہاں ہے۔ گیراج کوٹھی کی پچھلی طرف تھا۔ گاڑی گیٹ میں داخل ہو کر اندر جاتی تھی۔ کوٹھی کے پہلو سے گزر کر پچھواڑے دائیں کو مُڑتی تھی اور کوٹھی کے سامنے والے کونے کے ساتھ گیراج تھا۔ کوٹھی کے پچھواڑے دو سرونٹ کوارٹر تھے۔ ایک میں خانساماں اور دوسرے میں نوکر رہتا تھا۔ نوکر اکیلا تھا۔

ہم گیراج تک گئے اس کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔

"عمران صاحب!" ـــ میں نے کہا ـــ "کیا آپ کے یہ ملازم چرس اور افیم پی کر سوتے ہیں؟ رات کسی وقت گاڑی سٹارٹ ہوتی، ریورس ہوتی، سیدھی ہوتی اور باہر نکل گئی۔ ان نوکروں کو خبر تک نہ ہوتی۔"

"اس کا جواب تو نوکر ہی دے سکتے ہیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "میری اتنی قیمتی گاڑی چوری ہوئی اور معلوم ہُوا ہے کہ اس میں سے گولی گزری ہے۔ یہ سامنے سے بھی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ میری دلچسپی یہ ہے کہ چور کو پکڑا جائے جو آپ کا کام ہے۔"

ہم نے عمران کو کوٹھی کے اندر بیٹھنے کو کہا اور خانسامے کو الگ کر کے کوٹھی کے برآمدے میں بٹھا لیا۔ عمران علی نے اپنے بیان میں بتایا کہ سب سے پہلے خانسامے کو پتہ چلا تھا کہ کار گیراج میں نہیں ہے۔

"تمہیں کس وقت پتہ چلا تھا کہ گاڑی غائب ہے؟" ـــ میں نے خانسامے سے پوچھا۔

"صبح سویرے دُودھ والا آیا" ـــ خانسامے نے جواب دیا ـــ "وہ روزانہ اپنی سائیکل کی گھنٹی بجاتا ہے۔ میں اُس وقت جاگا ہُوا ہوتا ہوں اور جاکر دُودھ لے لیتا ہوں۔ اُس روز بھی ایسے ہی ہُوا۔ میں دُودھ لے کر کوٹھی کے پیچھے سے باورچی خانے میں جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ گاڑی گیراج

میں نہیں ہے۔ میں نے نوکر کے کوارٹر میں جاکر پوچھا کہ صاحب کس وقت گئے ہیں اور کب آئیں گے .... میں نے ناشتے کے لئے پوچھا تھا۔ نوکر اندر گیا تو اُس نے آکر بتایا کہ صاحب تو بیڈروم میں سوتے ہوتے ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ گیراج میں گاڑی نہیں ہے۔ نوکر کہنے لگا کہ ان کا کوئی دوست لے گیا ہوگا۔"

"کیا باہر کا گیٹ کھلا ہُوا تھا؟"

"گیٹ تو بند تھا" ـــ اُس نے جواب دیا پھر تذبذب میں پڑ گیا اور بولا ـــ "شاید کھلا ہُوا تھا .... نہیں بند تھا۔"

گیٹ کم و بیش چھ فٹ اونچا تھا اور اتنی ہی اونچی دیوار کوٹھی کے چاروں طرف تھی۔ باہر سے کسی کا دیوار پھاند کر اندر آنا نہایت آسان تھا، لیکن سوچنے والی بات یہ تھی کہ کار اگر چور لے گئے تھے تو کیا وہ گیٹ اندر سے بند کر گئے تھے؟ میں نے خانساماں سے کہا کہ وہ سوچ کر صحیح جواب دے کہ گیٹ کھلا تھا یا بند تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ گیٹ بند تھا۔

"عمران صاحب صبح کتنے بجے اُٹھتے ہیں؟"

"عموماً سورج نکلنے کے بعد" ـــ خانساماں نے جواب دیا۔

اسے چھوڑ کر ہم نے نوکر کو بلایا۔ اُس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ عمران روزانہ صبح کس وقت اُٹھتا ہے۔ اُس نے بھی بتایا کہ سورج نکلنے کے بعد اُٹھتا ہے۔

"تمہیں خانساماں نے بتایا تھا کہ گاڑی گیراج میں نہیں ہے" ـــ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ـــ "جب تم اپنے صاحب کو دیکھنے گئے کہ وہ گھر میں ہے یا گاڑی لے کر چلا گیا ہے تو کیا وہ سویا ہُوا تھا؟"

"نہیں صاحب!" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "صاحب جاگے ہوتے تھے اور شیو کر رہے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ گاڑی کون لے گیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ گاڑی تو گیراج میں ہے۔ میں نے کہا کہ گاڑی گیراج میں نہیں ہے۔ صاحب نے باہر آکر دیکھا اور اُسی وقت باہر نکل گئے۔ بہت

دیر بعد واپس آئے اور اُنہوں نے بتایا کہ وہ تھانے میں رپورٹ لکھوا آئے ہیں۔ شام کے وقت انہوں نے بتایا کہ گاڑی مل گئی ہے اور پولیس کے قبضے میں ہے اور چور بھاگ گیا ہے۔"

ہم نے نوکر اور خانساماں سے یہ بھی پوچھا تھا کہ عمران علی رات کتنے بجے واپس آیا تھا۔ دونوں نے دس بجے کا وقت بتایا تھا۔ عمران علی نے بھی ہمیں یہی وقت بتایا تھا۔

"تمہارا صاحب رات دس بجے واپس آیا تو گیٹ کس نے کھولا تھا؟" ـــ میں نے نوکر سے پوچھا۔

"میں نے" ـــ اُس نے جواب دیا۔

"کیا اُس وقت تمہارے پاس گھڑی تھی؟"

"نہیں جناب!" ـــ اُس نے جواب دیا۔

"پھر تم کیسے جان گئے کہ پورے دس بجے ہیں؟"

"یہ میرا اندازہ تھا جناب!" ـــ اُس نے کہا۔

اس نوکر کو ذرا پرے بھیج کر خانساماں کو پھر بلایا اور اس سے پوچھا کہ جب عمران علی واپس آیا تو وہ کیا کر رہا تھا۔

"میں سو گیا تھا" ـــ اُس نے جواب دیا۔

"پھر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ تمہارا صاحب رات کے پورے دس بجے آیا تھا؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "نوکر سے تو تم نے پوچھا ہی نہیں تھا کہ صاحب رات کس وقت آیا تھا۔"

"دس بجے" پر میں اور ٹینیسن اس وجہ سے اٹک گئے تھے کہ عمران علی، نوکر اور خانساماں ٹھیک دس بجے کا وقت بتا رہے تھے۔ عموماً کہا جاتا ہے، ساڑھے نو دس بجے یا دس ساڑھے دس بجے نوکر چاکر تو پورے ایک گھنٹے کا فرق رکھتے ہیں یعنی نو دس بجے یا دس گیارہ بجے۔

خانساماں اس سوال پر کچھ پریشان ہو گیا کہ اُس نے نوکر سے پوچھا تھا یا نہیں کہ عمران علی رات کو کتنے بجے آیا تھا۔ اُس نے گھبراہٹ کے

لہجے میں کہا کہ نوکر سے اُس نے بعد میں پوچھا تھا۔

مَیں نے نوکر کو بلایا اور خانسامے کی موجودگی میں پوچھا کہ خانسامے نے اُس سے کس وقت پوچھا تھا کہ صاحب رات کتنے بجے آیا تھا۔ نوکر ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے خود اعتمادی سے کہا کہ اُسے یاد نہیں۔ مَیں نے کہا کہ یاد کر کے بتائے۔

"اتنے زیادہ دن گزر گئے ہیں صاحب!" — اُس نے فوراً جواب دیا — "گاڑی کی چوری نے ہمارے تو ہوش ہی گُم کر دیئے تھے۔"

"مَیں نے تم سے اُسی دن یا دوسرے دن پوچھا تھا" — خانسامے نے اُسے کہا۔

"پوچھا ہوگا" — نوکر نے کہا — "مجھے یاد نہیں۔"

خانسامے کی بیوی اور دو بچّے

ہمارے ساتھ دو کانسٹیبل تھے۔ مَیں نے ایک سے کہا کہ سرونٹ کوارٹروں میں جا کر خانسامے کی بیوی کو بلا لائے۔ نوکر اور خانسامے کو ہم نے یہ کہہ کر پرے بھیج دیا کہ ایک دوسرے سے دُور دُور بیٹھیں۔ چار پانچ منٹ بعد خانسامے کی بیوی آ گئی۔

"بیٹھ جا بی بی!" — مَیں نے اُسے بٹھا کر پوچھا — "جس رات عمران صاحب کی کار چوری ہوئی تھی اُس رات وہ کتنے بجے باہر سے واپس آئے تھے؟"

"دس بجے!" — اُس نے جواب دیا۔

"کیا تم نے اُس وقت گھڑی دیکھی تھی؟"

"نہیں صاحب!" — اُس نے جواب دیا — "مجھے خاوند نے بتایا تھا۔"

"کس وقت بتایا تھا؟" — مَیں نے پوچھا — "اُسی رات؟ .... صبح؟ .... دوپہر؟ .... کس وقت؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"دیکھ بی بی!" — مَیں نے کہا — "ہم پولیس کے افسر ہیں۔ یہ دیکھ رہی ہو۔ یہ انگریز صاحب پولیس انسپکٹر ہے۔ جھوٹ بولو گی تو اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو مصیبت میں ڈالو گی۔ تمہارے بچّے بھی ہیں .... اب بات کرو۔ تمہیں خاوند نے کس وقت بتایا تھا کہ رات صاحب دس بجے آیا تھا۔"

"دوسرے دن" — اُس نے جواب دیا۔

"کیا تم نے اُس سے پوچھا تھا یا اُس نے خود ہی بتایا تھا؟"

"اُس نے خود ہی بتایا تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"کیوں بتایا تھا؟" — مَیں نے پوچھا — "عمران صاحب تو روزانہ رات کبھی کسی وقت کبھی کسی وقت واپس آیا کرتا تھا۔ کیا تمہارا خاوند ہر روز تمہیں بتایا کرتا ہے کہ رات صاحب اتنے بجے آیا تھا؟"

"نہیں!"

"پھر اُس روز اُس نے کیوں بتایا تھا؟" — مَیں نے کہا — "اُس نے کوئی اور بات بھی کی ہوگی۔ مَیں تمہیں پھر کہتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولنا۔"

اِس عورت پر مرعوبیت طاری ہو چکی تھی۔ وہ ایک خانسامے کی بیوی تھی۔ انگریزوں کو یہ لوگ آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے سمجھا کرتے تھے۔ ایک انگریز افسر اُس کے سامنے بیٹھا اُسے گھور رہا تھا۔

"مجھے بالکل علم نہیں صاحب کہ اُس روز اُس نے مجھے کیوں بتایا تھا کہ رات صاحب دس بجے آیا تھا" — اِس عورت نے جواب دیا — "اُس نے کہا تھا کہ تم سے کوئی پوچھے تو کہنا کہ عمران صاحب رات دس بجے آتے تھے۔"

"اُس وقت یعنی رات دس بجے تمہارا خاوند کیا کر رہا تھا؟"

"سویا ہُوا تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"اور تم؟"

"میں بھی سو گئی تھی"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"رات جب کار آئی تو کیا تمہیں پتہ چل گیا تھا؟"

"نہیں صاحب!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"اگر تمہیں صحیح معلوم ہے کہ صاحب کس وقت آئے تھے تو بہتر ہے بتا دو"۔۔۔ میں نے کہا۔

اُس نے ہاتھ جوڑ کر قسمیں کھانی شروع کر دیں۔ کہتی تھی کہ اُسے معلوم نہیں کہ رات عمران علی کس وقت آیا تھا۔

"کیا عمران صاحب نے خود بھی تمہیں کہا تھا کہ کوئی پوچھے تو یہ بتانا کہ صاحب رات دس بجے آ گئے تھے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "صاحب کے ساتھ میری کبھی بات ہی نہیں ہوئی"۔

"انسپکٹر ملک!"۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے انگریزی میں کہا۔۔۔ "یہ واضح ہو گیا ہے کہ یہ شخص رات دس بجے واپس نہیں آیا تھا۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے نوکروں کو بتایا تھا کہ کوئی پوچھے تو اس کی واپسی کا وقت دس بجے بتائیں۔ ان سب کو ہم اپنے ساتھ لے چلتے ہیں"۔

"میرا خیال ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "عمران سے ایک بار پھر بات کر لیتے ہیں"۔

انسپکٹر ٹینیسن نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سائیکل پر ایک آدمی گیٹ میں داخل ہُوا اور سائیکل روک کر اُترا۔ سائیکل کے پیچھے کیریئر پر چھوٹا سا ایک بکس رکھا ہُوا تھا۔ وہ ذرا آگے آیا اور جھک کر رُک گیا۔ وہ ہمیں پولیس کے افسر نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ ہم وردی میں نہیں تھے۔ سی آئی اے کا تمام سٹاف پرائیویٹ کپڑوں میں ملبوس رہتا تھا۔ بہرحال وہ ہمیں دیکھ کر جھجک گیا تھا۔ میں نے اُسے اپنے پاس بلایا۔ وہ سائیکل رکھ کر ہمارے پاس آیا تو میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔

وہ پرائیویٹ پریکٹس کرنے والے ایک ڈاکٹر کا ڈسپنسر تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ عمران علی کے زخم کی مرہم پٹی کرنے آیا ہے۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ آٹھ نو دن گزرے عمران علی کے بائیں بازو پر کندھے کے قریب ایک زخم ہو گیا تھا اور وہ ہر روز اس کی مرہم پٹی کے لئے اسی وقت آیا کرتا ہے۔

میں نے عمران علی کے نوکر سے کہا کہ وہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نوکر اندر جائے۔ میں نے عمران علی کو باہر بلانا تھا۔ نوکر نے دروازے پر دستک دی تو عمران علی باہر آ گیا۔

"عمران صاحب!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "آپ زیادہ زخمی تو نہیں؟"

"نہیں صاحب!"۔۔۔ اُس نے شگفتہ سے لہجے میں جواب دیا۔۔۔ "کنسٹرکشن کا ایک کنٹریکٹ زیرِ تعمیر ہے۔ ایک روز وہاں گیا تو ایک نوکیلی لکڑی جو ایک مزدور کے ہاتھ میں تھی، میرے بازو کو اتنے زور سے لگ گئی کہ گہرا اور لمبا زخم ہو گیا۔ کسی ہسپتال یا کلینک میں جانے اور باری کا انتظار کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ ایک ڈاکٹر اپنے اس ڈسپنسر کو گھر ہی بھیج دیتا ہے"۔

"اسے اندر لے جائیں اور ڈریسنگ کروالیں"۔۔۔ میں نے کہا۔

ڈسپنسر اُس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

انسپکٹر ٹینیسن نے اُسے کہا تھا کہ ان سب کو سی آئی اے ہیڈکوارٹر میں لے چلتے ہیں اور میں نے اُس سے کہا تھا کہ عمران کے ساتھ ایک بار پھر بات کر لیتے ہیں۔ ہم نے خانسامے کی بیوی کو وہاں سے اُٹھا کر الگ بٹھا دیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے چھوٹے چھوٹے دو بچے کچھ دُور کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔ ایک بچہ بمشکل ڈیڑھ ایک سال کا تھا۔ انسپکٹر ٹینیسن نے ان بچوں کو دیکھا۔

"مسٹر ملک!"۔۔۔ اُس نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "میں یہ منظر برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو یہ بچے کس طرح ڈرے ہوئے

اپنی ماں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ان کی ماں کو اپنے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔"

مَیں نے خانسامے کی بیوی کو اپنے پاس بلا کر کہا کہ وہ بچوں کو ساتھ لے کر گھر چلی جائے۔ مَیں نے اُسے ڈرا دھمکا کر خبردار کیا کہ ہمارے ساتھ اُس کی جو باتیں اور جو سوال و جواب ہوتے ہیں وہ ان کا کسی کے ساتھ، اپنے خاوند کے ساتھ بھی ذکر نہ کرے۔ اگر عمران اُس سے پوچھے تو اُس کے آگے بھی جھوٹ بولے۔

وہ چلی گئی تو میں اور ٹینیسن عمران کے اِن ملازموں سے کی ہوئی تفتیش پر تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ یہ شک پختہ ہو گیا تھا کہ عمران علی حادثے کی رات دس بجے گھر نہیں آیا تھا۔ اس سے ہمیں یہ واضح اشارہ بھی ملا کہ اس کیس کی تفتیش سی آئی اے کو ہی کرنی چاہیئے۔ میں نے انسپکٹر ٹینیسن سے ازراہِ مذاق کہا کہ آخر وہی بات ہو گی کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ میرا مطلب تھا کہ آخر میں اتنی سی ہی واردات سامنے آئے گی کہ سائیکل کو ٹکر مارنے والی کار کا ڈرائیور عمران علی تھا اور یہ کار اُسی کی تھی اور حادثے کے بعد پکڑے جانے کے خوف سے وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس پر گولیاں چلیں تو وہ کار سے نکل کر بھاگ گیا اور صبح تھانے میں یہ رپورٹ لکھوا آیا کہ اُس کی کار کوٹھی کے اندر سے چوری ہو گئی ہے۔

خون آلود رومال

ڈسپنسر عمران کی مرہم پٹی کر کے باہر نکلا تو مَیں نے عمران کو بلایا۔

"مسٹر عمران!" — انسپکٹر ٹینیسن نے اُسے کہا — "میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ صحیح بات بتا دو۔ معمولی سی واردات ہے۔ پہلے بھی ایک واردات میں تمہارے ساتھ ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ہم نے تمہاری کتنی عزت افزائی کی تھی۔"

"انسپکٹر ٹینیسن!" — عمران علی نے جھنجھلا کر کہا — "میں حیران ہوں کہ اتنی معمولی سی واردات کو سی آئی اے کے حوالے کیوں کر دیا گیا ہے۔ میں رپورٹ دے رہا ہوں کہ میری کار..."

"مسٹر عمران!" — انسپکٹر ٹینیسن نے اُسے آگے بولنے سے روک دیا اور کہا — "کوٹھی بند کریں۔ خانسامے کی بیوی یہیں رہے گی۔ یہاں چوکیداری بھی کرے گی۔ تم ہمارے ساتھ چلو گے۔ یہ دونوں ملازم بھی ہمارے ساتھ آئیں گے۔"

"معاف رکھنا انسپکٹر ٹینیسن!" — مَیں نے کہا — "ہم اپنا ایک آدمی یہاں چھوڑ جائیں گے" — مَیں نے عمران علی سے کہا — "عمران صاحب! ہمیں وہ کمرہ دکھا دیں جہاں ٹیلیفون رکھا ہے۔ ہمارا ایک آدمی اس کمرے میں بیٹھے گا تاکہ ہم اپنے آفس سے اس کے ساتھ رابطہ کر سکیں۔"

عمران علی یوں کھڑا رہا جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو۔ اُس کے چہرے کے تاثرات میں جو تبدیلی آئی وہ اتنی نمایاں تھی کہ اسے معمولی سی ذہانت والا کوئی بھی آدمی بھانپ سکتا تھا۔ ہمارے ساتھ دو کانسٹیبل تھے اور ایک ہیڈ کانسٹیبل۔ یہ تینوں بھی ہماری طرح پرائیویٹ کپڑوں میں تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل مسلمان تھا جس کا نام شاہد حمید تھا۔ سی آئی اے میں اُس کی سروس خاصی لمبی ہو گئی تھی۔ تجربہ کار تھا اور ویسے بھی ذہین آدمی تھا۔ اُس کی تعلیم میٹرک تک تھی جو اُس وقت کے مطابق بڑی اچھی تعلیم سمجھی جاتی تھی۔

میں نے اُسے بلایا۔ عمران علی ٹیلیفون کا کمرہ دکھانے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا، آئیے عمران صاحب! وہ چل پڑا اور وہ کمرہ ہمیں دکھایا جس میں ٹیلیفون رکھا تھا۔ میں نے اِس فون کا نمبر نوٹ کر لیا پھر عمران کو تسلی دی کہ یہ کمرہ محفوظ رہے گا۔ اُسے باہر بھیج کر مَیں نے ہیڈ کانسٹیبل شاہد حمید کو کچھ ہدایات دیں اور ہر

ہدایت نہایت اچھی طرح واضح کر دی۔ یہ کام اُس کے لئے نیا نہیں تھا۔ ایسے کام وہ پہلے کئی بار کر چکا تھا۔

ہمارے پاس اُس وقت پندرہ ہنڈرڈ ویٹ فوجی قسم کی گاڑی تھی۔ یہ بڑے فوجی ٹرک سے آدھی ہوتی تھی۔ ہم نے عمران علی اور اُس کے دونوں ملازموں کو اس گاڑی میں بٹھایا۔ دو کانسٹیبل ساتھ تھے اور ڈرائیور بھی تھا۔ ہم نے ابھی عمران علی کی کار نہیں دیکھی تھی۔ کار اُس تھانے میں پڑی تھی جس کے علاقے میں اس کا ڈرائیور چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ ہم اپنے ہیڈ کوارٹر میں جانے سے پہلے اس تھانے میں چلے گئے۔

عمران علی کی کار وہاں کھڑی تھی۔ عمران علی اور اُس کے ملازموں کو گاڑی سے اُتارا۔ پہلے عمران علی کو کار کے پاس لے گئے۔

"عمران صاحب!" — میں نے اُسے کہا — "اس گاڑی کو اچھی طرح دیکھیں اور بتائیں کہ یہ آپ کی ہے؟"

"کوئی شک ہی نہیں صاحب!" — اُس نے جواب دیا — "اس کی رجسٹریشن ڈیش بورڈ میں پڑی ہے۔"

رجسٹریشن اور لائسنس اس تھانے کے ایس ایچ او نے کار سے نکال کر اپنے قبضے میں رکھ لئے تھے جو اُس نے ہمارے حوالے کر دیئے۔

ہم نے عمران علی کے نوکر کو پھر اُس کے خانساماں کو باری باری بلا کر کار کی شناخت کرائی۔ اُنہوں نے بھی یہی کہا کہ یہ عمران علی کی کار ہے۔

ہم نے کار کا معائنہ کیا۔ اس کا کوئی ٹائر پنکچر نہیں ہُوا تھا۔ اس پر فوجیوں نے ٹائر پنکچر کرنے کے لئے گولیاں چلائی تھیں لیکن کسی ٹائر پر گولی نہ لگی۔ کار میں دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی دائیں طرف کے پچھلے مڈگارڈ میں سے گزر گئی تھی اور ایک گولی کار کے پچھلے شیشے میں لگی اور سامنے والے شیشے یعنی ونڈ سکرین سے نیچے جا کر پھنس گئی۔ گولی

دُور سے چلائی گئی تھی اس لئے پچھلے شیشے کو توڑ کر گزرتے ہوئے گولی کی رفتار خاصی کم ہو گئی اور اُس جگہ لگ کر پھنس گئی جہاں سپیڈو میٹر اور دوسرے گیج لگے ہوتے ہیں۔

ہم نے کار کی تلاشی لی۔ اس میں سے کوئی خاص چیز برآمد نہ ہوئی۔ ہم نے عمران علی اور اُس کے ملازموں کو اپنی گاڑی میں بٹھا دیا اور ہم دونوں تھانے کے ایس ایچ او سب انسپکٹر ہرنام داس کو اُس کے دفتر میں لے گئے۔ وہ ہوشیار پور کا رہنے والا ہندو تھا۔ اُس نے میرے ساتھ ہی ٹریننگ کی تھی۔

"اب بتاؤ ہرنام داس!" — میں نے اُس سے پوچھا — "تم نے کیا کچھ کارروائی کی ہے۔"

اُس نے پولیس کی زبان میں اُس وقت سے جب اُسے فوجیوں نے اس کار کی رپورٹ دی تھی، لے کر ہماری ملاقات تک جو کارروائی کی تھی ہمیں سنانی شروع کر دی۔ ہم دونوں اس اتنی لمبی کہانی میں سے اپنے مطلب کی باتیں ذہن میں محفوظ رکھتے گئے۔ جب ہرنام داس ساری روئیداد بیان کر چکا تو ہم نے سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"تم نے موقعہ پر جا کر کار دیکھی تھی" — انسپکٹر ٹینین نے کہا — "کیا اُس علاقے میں کوئی کھرا نہیں دیکھا تھا؟ تم نے کسی کھرے کا ذکر نہیں کیا۔"

"میں نے سب سے پہلی چیز یہی دیکھنی تھی" — ہرنام داس نے کہا — "لیکن بدقسمتی سے ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ کھرے بڑی جلدی صاف ہو گئے۔ کھروں کے لئے یہ زمین بہت ہی اچھی ہے۔ وہاں کی مٹی آٹے کی طرح ہے۔ اس پر انگلیوں کے نشان بھی واضح ہو سکتے ہیں لیکن اتنی باریک مٹی نے نقصان یہ پہنچایا کہ تیز ہوا سے اُڑ اُڑ کر کھرے بھر دیتے۔ کار والا کار سے نکل کر جس طرف گیا تھا میں صبح کے وقت اُدھر گیا تھا لیکن کچھ نہ ملا کیونکہ آگے کٹی پھٹی زمین آجاتی ہے اور اس سے آگے ایک سڑک

ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملزم سڑک تک پہنچ گیا اور وہاں سے اُسے تانگہ وانگہ مل گیا ہوگا" — اُس نے اپنی میز کا دروازہ کھولا اور بولا — "میں آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا سُراغ ہے۔"

اُس نے دراز میں سے ایک لفافہ نکالا۔ اس میں سے ایک کپڑا نکالا اور یہ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ پہلے انسپکٹر ٹینیسن نے اسے دیکھا پھر اُس نے مجھے دے دیا۔ یہ سفید رنگ کا ایک جیبی رومال تھا جس کا رنگ خون جیسا تھا۔ اس کے دو کونے اصلی رنگ میں تھے یعنی سفید۔ ایک کونے پر چھوٹا سا دھوبی مارک تھا۔ خون کا رنگ بدلا ہُوا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ خون بہت دن پہلے اس پر لگا تھا۔

"یہ رومال حادثے کی رات ہی مجھے کٹی پھٹی زمین اور اس کے آگے والی سڑک کے درمیان ایک جگہ پڑا ملا تھا" — سب انسپکٹر ہرنام داس نے کہا — "اُس وقت یہ خون تازہ تھا۔ اتنا تازہ کہ میرے ہاتھوں کو بھی لگ گیا تھا۔"

"اس سے تم کیا سمجھے تھے؟"

"جواب بالکل صاف ہے" — ہرنام داس نے جواب دیا — "ملزم زخمی تھا۔ اُس نے اپنا یہ رومال زخم پر رکھا یا باندھا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اُسے زخم کہاں آیا تھا۔ ہُوا یہ کہ وہ بھاگا جا رہا تھا اس لئے جلدی میں تھا۔ بھاگتے بھاگتے رومال کھُل کر گر پڑا یا اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا۔ رومال اُٹھانے کے لئے اُس کے پاس رُکنے کا وقت نہ تھا۔ میں نے یہ رومال ڈی ایس پی صاحب کو دکھایا تھا۔ اُن کے حکم کے مطابق ایگزیبٹ کے طور پر رکھ لیا تھا۔"

"انسپکٹر ملک!" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "عمران علی کو یہاں لے آؤ۔"

میں باہر گیا اور عمران علی کو گاڑی سے اُتار کر اندر لے گیا۔

"مسٹر عمران!" — انسپکٹر ٹینیسن نے اُس سے کہا — اپنی

قمیض اُتار دو۔"

عمران علی پریشان سا ہو گیا۔ وہ قمیض اُتارنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے احتجاجاً کہا کہ اُسے بلاوجہ پریشان کیا جا رہا ہے۔

"عمران بھائی!" — میں نے اُسے اُردو میں کہا — "ہم تمہیں کوئی ٹھیکہ دلوانے اپنے ساتھ نہیں لائے۔ ایک تفتیش کے سلسلے میں تم پولیس کے ساتھ ہو اور ہو سکتا ہے کہ پولیس کا ساتھ پولیس کی حراست کی صورت اختیار کر لے... قمیض اُتار دو۔"

وہی حسینہ — پُراسرار اور بیتاب

اُس نے بادلِ نخواستہ قمیض اُتار دی۔ میں نے اور ٹینیسن نے اس قمیض پر دھوبی مارک ڈھونڈنا شروع کر دیا جو بڑی جلدی مل گیا۔ یہ قمیض کے اندر بٹنوں والے حصّے کے نیچے تھا۔ ہم نے اس نشان کو اُس نشان سے ملایا جو خون آلود رومال کے کونے پر تھا۔ یہ سو فیصد ایک ہی نشان تھا۔ میرا اور انسپکٹر ٹینیسن کا ردِعمل ایک جیسا تھا جو یہ تھا کہ ہم دونوں نے چونک کر عمران علی کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کا اتنا اچھا رنگ اچانک پھیکا پڑ گیا۔ وہ آخر صاحبِ حیثیت اور دولتمند تھا۔ اُونچی سوسائٹی میں گھُومنے پھرنے والا تھا اس لئے وہ خاموش نہ رہ سکا۔

"کیا کر رہے ہیں آپ ملک صاحب؟" — اُس نے مجھ سے اُردو میں کہا پھر انگریزی میں انسپکٹر ٹینیسن سے کہا — "یہ سب کیا ہے انسپکٹر ٹینی سن؟ آپ میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں جیسے میں کوئی جرائم پیشہ آدمی ہوں۔"

نہ میں نے اُسے کوئی جواب دیا نہ انسپکٹر ٹینیسن نے۔ وہ کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔

آجکل لوگ نائیلون اور کیٹی جیسے کپڑے پہنتے ہیں۔ امیر کبیر لوگ اپنے کپڑے ڈرائی کلینروں کے ہاں دُھلنے کے لئے بھیج دیتے ہیں جہاں کپڑوں پر کوئی دھوبی مارک نہیں لگتا۔ اس کے علاوہ گھروں میں لوگوں نے واشنگ مشینیں رکھی ہوئی ہیں۔ گھروں میں نوکر کپڑے دھو لیا کرتے ہیں اس لئے ان پر بھی دھوبی مارک نہیں ہوتا۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت نائیلون اور کیٹی نہیں تھی۔ امیر لوگ بھی سوتی کپڑے پہنتے تھے اور یہ کپڑے دھوبیوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ہر کپڑے پر دھوبی مارک ضرور ہوتا تھا۔

"مسٹر عمران!" — انسپکٹر ٹینیسن نے قمیض اور رومال کے دھوبی مارک عمران کے آگے کر کے پوچھا — "کیا یہ تمہارے دھوبی کے نشان ہیں؟"

"میں کچھ نہیں جانتا" — عمران علی نے احتجاج کے رنگ میں جواب دیا — "میں نے کبھی اپنے کپڑوں پر نہیں دیکھا کہ ان پر دھوبی کا نشان ہے یا نہیں۔"

"دھوبی نشان کون دیکھا کرتا ہے؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا — "دھوبی سے کپڑے کون وصول کرتا ہے؟"

"یہ میرے نوکر کا کام ہے" — عمران علی نے جواب دیا — "میرا خیال ہے دھوبی مارک وہ بھی نہیں دیکھتا ہو گا۔"

میں نے رومال اور قمیض اُٹھائی اور برآمدے میں نکل گیا۔ عمران علی کے نوکر کو بلایا جو گاڑی میں بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ آیا تو میں نے اُسے صرف قمیض والا نشان دکھایا اور پوچھا کہ یہ عمران علی کے کپڑوں کا دھوبی مارک ہے؟

"میں نے دھوبی کا نشان کبھی غور سے نہیں دیکھا" — نوکر نے کہا — "یہ تو دھوبی ہی بتا سکتا ہے۔ دھوبی گھر سے کپڑے لے جاتا ہے اور دھو کر واپس دے جاتا ہے۔"

اس نشان کی تصدیق دھوبی ہی کر سکتا تھا۔ تصدیق تو دراصل ہو

ہی گئی تھی۔ قمیض اور رومال کے نشان شکل کے علاوہ سائز میں بھی ایک جیسے تھے۔ میں نے اندر آ کر قمیض عمران علی کو دے کر کہا کہ پہن لے پھر اُسے کہا کہ وہ گاڑی میں جا کر بیٹھے۔ وہ باہر نکل گیا۔ میں نے دروازے میں جا کر دیکھا کہ وہ گاڑی میں ہی بیٹھا ہے، بھاگ نہیں گیا۔

"انسپکٹر ملک!" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "اس نے جب قمیض اُتاری تھی تو میں نے اُس کے بازو کے زخم پر پٹی بندھی ہوئی دیکھی اور اس پر غور کیا۔ میرے ساتھ اس کی کار تک آؤ۔"

میں اور سب انسپکٹر ہرنام داس اُس کے پیچھے پیچھے گئے۔ کار تک گئے تو اُس نے اگلا دروازہ کھول کر مجھے اگلی سیٹ پر سٹیئرنگ پر بٹھا دیا اور کہنے لگا کہ سٹیئرنگ کو اس طرح پکڑو جس طرح گاڑی چلاتے وقت پکڑا جاتا ہے۔

میں نے ڈرائیونگ کی پوزیشن میں سٹیئرنگ پکڑ لیا۔ انسپکٹر ٹینیسن کار کی پچھلی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس نے ایک دھاگہ یا رسّی منگوائی ہے۔ سب انسپکٹر ہرنام داس دھاگہ یا رسّی لانے کے لئے چلا گیا تھا۔

"جانتے ہو میں نے کیا دیکھا ہے؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دیا — "میں نے اس سوراخ پر جو پچھلے شیشے میں گولی نے بنایا ہے، آنکھ رکھ کر ڈیش بورڈ کی اُس جگہ کو دیکھا ہے جہاں آ کر یہ گولی لگی ہے۔ تمہارا بایاں بازو گولی کے راستے میں آتا ہے۔"

سب انسپکٹر ہرنام داس ایک رسّی لے آیا۔ انسپکٹر ٹینیسن نے اس رسّی کا سرا پچھلے شیشے کے گولی والے سوراخ میں سے گزارا پھر اُس نے ہرنام داس سے کہا کہ وہ یہ سرا اُس جگہ رکھے جہاں ڈیش بورڈ میں گولی لگی تھی۔ اُس نے مجھے پھر اُسی طرح ڈرائیونگ کی پوزیشن میں بیٹھنے کو کہا۔

میں ڈرائیونگ پوزیشن میں ہو گیا اور سٹیئرنگ کو پکڑ لیا۔ ہرنام داس نے رسّی کا سرا اُس جگہ دبا کر رکھا ہُوا تھا جہاں ڈیش بورڈ پر گولی لگی تھی۔

ٹینیسن نے کار کے پیچھے جا کر رسّی کو کھینچا۔ یہ رسّی میرے بائیں بازو کو اُس جگہ دبا رہی تھی جو کہنی کے اُوپر اور کندھے کے جوڑ کے درمیان تھی۔ میں سمجھ گیا کہ انسپکٹر ٹینیسن کیا دیکھ رہا ہے۔

انسپکٹر ٹینیسن رسّی چھوڑ کر آگے آگیا اور اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا سمجھا ہوں۔

"میں سمجھ گیا ہوں" ـــ میں نے کہا ـــ "گولی شیشے میں سے گزر کر ڈرائیور کے بازو کو تھوڑا سا کاٹتی ہوئی سٹیئرنگ کے درمیان سے گزری اور ڈیش بورڈ میں داخل ہو گئی .... عمران علی کے بازو کو اسی گولی نے زخمی کیا ہے۔"

ہم کار سے ہٹ آئے اور عمران علی کو ایک بار پھر گاڑی سے اتار کر ہرنام داس کے کمرے میں لے گئے۔ انسپکٹر ٹینیسن نے اُسے قمیض اُتارنے کو کہا۔ اُس نے قمیض اُتار دی۔ انسپکٹر ٹینیسن نے اُس کے بازو پر بندھی ہوئی پٹی کھولنی شروع کر دی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" ـــ عمران علی نے بازو اپنی طرف کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"پٹی ٹھیک نہیں بندھی ہوئی" ـــ انسپکٹر ٹینیسن نے پٹی کھولتے ہوئے کہا ـــ "مجھے زخموں کی ڈریسنگ کا بہت تجربہ ہے۔ میں تمہاری پٹی صحیح طریقوں سے باندھوں گا۔"

اُس نے پٹی کھول دی اور زخم کو ننگا کر دیا۔ میں نے آگے ہو کر دیکھا زخم تو دو انچ سے کچھ زیادہ لمبا تھا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ گولی کا زخم ہے۔ چاقو یا ایسے ہی کسی تیز دھار آلے کے زخم اور گولی کے لمبوترے زخم میں بہت فرق ہوتا ہے۔

"یہ زخم کیسے آیا ہے؟" ـــ انسپکٹر ٹینیسن نے عمران علی سے پوچھا۔

اُس نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے کوٹھی میں دے چکا تھا یعنی یہ

کہ ایک مزدور نے ایک نوکیلی لکڑی اُٹھا رکھی تھی جو اسے لگ گئی تھی۔

"میں اس مزدور سے ملنا چاہوں گا" ـــ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ـــ "میں ان دو تین آدمیوں سے بھی ملنا چاہوں گا جنہوں نے وہاں تمہیں زخمی ہوتے دیکھا تھا۔"

"جناب کنٹریکٹر صاحب!" ـــ میں نے اُسے اُردو میں کہا ـــ "آپ ہمارا وقت ہی ضائع نہیں کر رہے بلکہ اپنے آپ کو بہت بڑی مصیبت میں ڈال رہے ہیں۔ کیا اب بھی آپ صحیح بات نہیں بتائیں گے؟"

"کچھ سمجھ نہیں آتی" ـــ عمران علی نے دُکھ زدہ سے لہجے میں جواب دیا ـــ "معلوم نہیں آپ کیا کر رہے ہیں۔"

"یہ بھی آپ کو معلوم ہو جائے گا" ـــ میں نے کہا۔

ہم نے خون آلود رومال لفافے میں ڈال کر ساتھ لے لیا۔ عمران علی کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور ہم اپنے ہیڈ کوارٹر کو روانہ ہو گئے۔

وہاں پہنچ کر عمران علی، اُس کے خانساماں اور نوکر کو الگ الگ بٹھا دیا۔ میں اور انسپکٹر ٹینیسن کچھ کھانے پینے کے لئے چلے گئے اور دو گھنٹے بعد واپس آئے۔ اکٹھے بیٹھ کر کچھ دیر تبادلۂ خیالات کیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اپنی کار عمران علی خود چلا رہا تھا لیکن ابھی ہمیں اور بھی بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔

مجھے ہیڈ کانسٹیبل شاہد حمید کا خیال آگیا۔ اُسے عمران علی کی کوٹھی میں بٹھائے تین ساڑھے تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ میں نے اُس سے رپورٹ لینے کے لئے ٹیلی فون پر عمران علی کی کوٹھی کا نمبر ملایا۔ اُدھر شاہد حمید نے ریسیور اُٹھایا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ عمران علی کے لئے چار فون آ چکے ہیں۔ تین فون آدمیوں کے تھے۔ دو سے شاہد حمید نے اُن سے فون نمبر لے لئے تھے۔ تیسرے آدمی نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ میں پھر فون کر لوں گا۔ شاہد حمید انہیں بتاتا رہا کہ وہ عمران علی کا نوکر بول رہا ہے۔

چوتھے فون کا سُن کر میں چونک اُٹھا۔ وہ ایک عورت کا تھا۔ شاہد حمید نے اُس سے نام پوچھا تو اس عورت نے اپنا نام وجنتی بتایا۔ شاہد حمید نے اُس کا فون نمبر بھی لے لیا تھا۔

"وہ اپنا نمبر نہیں بتا رہی تھی"۔۔۔ شاہد حمید نے مجھے بتایا۔۔۔ "میں نے اُس سے کہا کہ میں فون نمبر نہ پوچھوں تو صاحب ناراض ہوتے ہیں، آپ میری خاطر نمبر بتا دیں .... اُس نے نمبر بتا دیا پھر اُس نے پوچھا کہ عمران کا زخم اب کیسا ہے۔ میں نے کہا کہ پہلے سے بہت اچھا ہے پھر اُس نے فون بند کر دیا۔"

قارئین کو یاد ہو گا کہ ڈیزی کے قتل میں اس انتہائی خوبصورت اور جوان لڑکی وجنتی کا خصوصی ذکر آیا ہے۔ مقتولہ ڈیزی کا خاوند ڈیلیل اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ قتل کی تفتیش کے دوران عمران علی سے میں نے پوچھا تھا کہ وہ وجنتی کو جانتا ہے یا نہیں۔ اُس نے جواب دیا تھا کہ وہ وجنتی کو نہیں جانتا۔

میں نے شاہد حمید سے وجنتی کا فون نمبر پوچھ لیا تھا۔ اُس کا نمبر ملایا۔ اُدھر کسی عورت نے ریسیور اُٹھا کر ہیلو کہا۔

"وجنتی!"۔۔۔ میں نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔

"بول رہی ہوں"۔۔۔ اُدھر سے آواز آئی۔۔۔ "کون؟"

میں نے سرگوشی میں کہا۔۔۔ "عمران"۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے؟"۔۔۔ وجنتی نے بیتابی سے کہا۔۔۔ "تمہارے گھر فون کیا پھر تمہارے دفتر فون کیا۔ اچھا بتاؤ گاڑی کا کیا بنا؟"

میں نے فون بند کر دیا تاکہ اُسے شک نہ ہو کہ یہ کوئی اور ہے۔ میں نے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ وجنتی اور عمران علی کی آپس میں بے تکلفی ہے یا تعلقات رسمی ہیں۔ وجنتی کی بے تابی بتا رہی تھی کہ تعلقات بہت گہرے ہیں۔

وجنتی کے ساتھ فون پر بات کرتے وقت انسپکٹر ٹینیسن میرے

پاس نہیں تھا۔ شاید اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ میں نے فون بند کیا تو میری ہنسی نکل گئی پھر ہنسی نکلتی ہی چلی گئی۔ کوئی آدمی اکیلا بیٹھا ہنس رہا ہو تو اُسے پاگل نہ کہیں، بیوقوف اور احمق تو ضرور ہی کہیں گے۔ انسپکٹر ٹینیسن کمرے میں داخل ہُوا تو میں ہنسی کے دَورے میں مبتلا تھا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ ٹینیسن میرے سامنے کھڑا ہے۔ اُس نے میری میز پر اس طرح انگلی دو تین دفعہ ماری جس طرح دروازے پر دستک دی جاتی ہے۔ میں نے چونک کر اُوپر دیکھا۔

"کیا ہُوا؟"

"اُس دلکش ساڑھی کے ساتھ فون پر بات ہوتی ہے"۔۔۔ میں نے جواب دیا۔

"کیا؟"۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے انگریزی میں WHAT کہا تھا لیکن ہماری طرح وُٹ نہ کہا بلکہ واٹ کہا اور الف کو بڑا لمبا کھینچا۔ یہ اُس کی حیرت کا اظہار تھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ اس دلکش ہندو لڑکی کو میں نے کس طرح فون کیا تھا اور صرف دو لفظ کہے تھے۔ پہلے پوچھا تھا، وجنتی؟ پھر کہا تھا عمران! .... میں نے ٹینیسن کو بتایا کہ وجنتی عمران علی کے لئے کتنی بیتاب تھی۔

"کیا اُسے تمہاری اور عمران علی کی آواز میں فرق معلوم نہیں ہو سکا؟"۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"وہ عمران علی کے لئے اتنی بے چین تھی کہ عمران کا نام ہی سُنا تو بول پڑی"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "آواز میں فرق معلوم نہ کر سکنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میں سرگوشی میں بولا تھا۔"

"اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عمران اور یہ لڑکی آپس میں سرگوشیوں میں بھی فون پر بات کیا کرتے ہیں"۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا۔۔۔ "ان میں رازداری ہے .... تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ان کی رازداری دوستی بلکہ ناجائز دوستی تک محدود ہو سکتی ہے"
—— میں نے کہا —— "لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ وجنتی کا باپ سیاست میں سرکردہ حیثیت رکھتا ہے اور وجنتی جو اپنے آپ کو سوشل ورکر کہتی ہے دراصل پولیٹیکل ورکر ہے، ہمارا یہ شبہ بے بنیاد نہیں ہو سکتا کہ عمران علی کے ساتھ اس لڑکی کا تعلق سیاسی مقاصد کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ ڈی ایس پی میڈیوز کی بریفنگ بھی یہی ہے .... اس میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ عمران علی خود گاڑی چلا رہا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ ڈسپنسر شعیب کو اس نے عمداً ٹکر ماری ہے۔ یہ قتل کی کوشش ہے پہلے میں کہتا تھا کہ عمران علی ڈسپنسر کو قتل کرنا چاہتا تو کسی اور سے قتل کروا سکتا تھا یا کوئی اور محفوظ طریقہ اختیار کرتا لیکن اب میرے ذہن میں یہی بات بیٹھ گئی ہے کہ حادثے کے علاقے میں اُس وقت ٹریفک نہیں تھی عمران علی کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ڈسپنسر فلاں وقت ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر جاتے گا۔ عمران علی کی سکیم یہ تھی کہ وہ ڈسپنسر کو کار تلے روند کر نکل جائے گا۔"

"وہ تو نکل ہی گیا تھا" —— انسپکٹر ٹینیسن نے کہا —— "یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ اچانک کہیں سے یہ فوجی جیپ نکل آئی۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ہسپتال کا نمبر ملایا اور کہا کہ ڈاکٹر کے ساتھ بات کراؤ۔ اُس نے ڈاکٹر سے ڈسپنسر کی حالت پوچھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ ٹینیسن نے پوچھا کہ ہوش میں آنے کا امکان ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر نے کچھ مایوسی کا اظہار کیا۔

ہم دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے عمران علی کے خانسامے کو بلایا۔ اسے اور نوکر کو ہم عمران علی کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر میں لاتے تھے اور انہیں الگ الگ بٹھا دیا تھا۔

"اوئے دیکھ میاں!" —— میں نے خانسامے سے کہا —— "کان کھول کر میری بات سُننا۔ تم کوٹھی میں بہت جھوٹ بول چکے ہو۔ اب سچ بولنا ورنہ یہاں اپنی ہڈیاں تڑوا لو گے پھر اپنے صاحب کے ساتھ کئی

سالوں کے لئے جیل میں بند ہو جاؤ گے۔ تمہاری بیوی جوان ہے۔ وہ خراب ہوتی پھرے گی اور تمہارے بچے بھیک مانگتے پھریں گے .... اپنی بیوی اور نوکر کے ساتھ بیان ملا تو لینا تھا۔"

اُس کا رنگ اُڑنا شروع ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ پیٹ کی خاطر اپنے صاحب کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے بچوں پر مجھے ترس آ رہا تھا۔

"اپنے صاحب سے نہ ڈرو" —— میں نے کہا —— "اُس نے ایک سائیکل سوار کو ٹکر ماری ہے کار سے" —— اور میں نے جھوٹ بولا —— "سائیکل سوار ہسپتال میں مر گیا ہے۔ تمہارے عمران صاحب کی باقی عمر اب جیل میں گزرے گی۔ اُسے خوش کرنے سے اب تمہیں فائدے کی بجائے نقصان ہو گا .... اب بتاؤ، سچ بولو گے؟ اپنی بیوی اور بچوں کے پاس جانا چاہتے ہو تو سچ بولو اور جاؤ۔"

"آپ خود عقلمند ہیں حضور!" —— اُس نے کہا —— "ہم نوکر چاکر مالکوں کی خوشی دیکھتے ہیں۔ آپ پوچھیں۔ صرف یہ عرض ہے کہ ہم غریبوں کا خیال رکھنا۔"

"اُس رات عمران علی کتنے بجے واپس آیا تھا؟"

"رات کا ایک بج چکا تھا صاحب!" —— خانسامے نے جواب دیا۔

"کیا وہ اپنی کار پر آیا تھا؟"

"یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ صاحب کار پر نہیں آیا تھا" —— اُس نے جواب دیا —— "مجھے نوکر کوارٹر سے بلانے آیا تھا۔ میں سویا ہُوا تھا۔ نوکر نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں باہر آیا۔ اُس نے کہا کہ صاحب بلاتے ہیں۔ میں گیا۔ صاحب بیڈروم میں تھا۔ اُس کی قمیض اُتری ہوئی فرش پر پڑی تھی۔ میں نے اُس پر خون دیکھا۔ ایک آستین تو پوری کی پوری لال ہو گئی تھی۔ صاحب کے بائیں بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔"

"کیا تمہیں اور نوکر کو عمران صاحب نے کہا تھا کہ کوئی پوچھے

تو بتانا کہ صاحب رات دس بجے کار پر گھر آ گئے تھے؟"——
میں نے پوچھا۔

"ہاں حضور!"——خانسامے نے جواب دیا——"انہوں نے مجھے کہا تھا کہ اپنی بیوی کو بھی سمجھا دینا۔"

خدا اور گھونسہ

خانسامے نے جو بیان دیا وہ یہاں سے شروع ہُوا کہ رات ایک بجے کے بعد نوکر اسے کوارٹر سے جگا کر عمران علی کے پاس لے آیا۔ عمران علی کو اُس نے زخمی حالت میں دیکھا۔ عمران علی نے اُسے نوکر کی موجودگی میں بتایا کہ کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور اس سے بازو زخمی ہو گیا ہے۔ اپنی کار کے متعلق اُس نے بتایا کہ ایک جگہ چھوڑ کر بھاگ آیا ہے۔

"تم دونوں نے جو بیان دینا ہے وہ میں تمہیں بتاتا ہوں"——عمران علی نے خانسامے اور نوکر سے کہا——"کہنا کہ صاحب رات دس بجے واپس گھر آ گئے تھے۔ کار گیراج میں رکھی تھی۔ صبح دیکھا، کار غائب تھی پھر صاحب تھانے رپورٹ درج کرانے چلے گئے تھے۔"

عمران علی نے ان دونوں ملازموں کو بیان زبانی یاد کرا دیئے۔ اُنہوں نے یہی جھوٹے بیان ہمیں دیئے۔ عمران انہیں یہ ٹریننگ نہ دے سکا کہ پولیس کی جرح اور تفتیش کا سامنا کس طرح کیا جاتا ہے۔ میں ان کے بیان دہرانا نہیں چاہتا۔ ہماری تفتیش میں نوکر، خانسامے اور خانسامے کی بیوی کے بیانات میں بڑا صاف فرق نظر آ گیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شک تو یہیں سے پیدا ہو گیا تھا کہ ہر کوئی ٹھیک دس بجے کہہ رہا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایک دو منٹ اُوپر یا نیچے نہیں کہتا تھا۔

خانسامے نے پردہ اُٹھا دیا۔ اُس سے ہم نے مزید تفتیش کی۔ کچھ اور باتیں پوچھیں اور اُسے باہر بھیج کر عمران علی کے نوکر کو بلایا۔

"کیوں بھائی!"——میں نے پوچھا——"اُس رات تمہارا صاحب کتنے بجے گھر آیا تھا؟"

"دس بجے حضور!"——اُس نے جواب دیا۔

انسپکٹر ٹینیسن اُس کے قریب کھڑا تھا اور نوکر بنچ پر بیٹھا ہُوا تھا۔ ٹینیسن نے اُس کے سامنے جا کر اُس کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اُسے اُوپر کو اُٹھا لیا۔ ٹینیسن ہٹا کٹا آدمی تھا اور نوکر کا جسم ٹینیسن کے جسم کا نصف تھا۔ نوکر کے پاؤں فرش سے تقریباً دو فٹ اُوپر اُٹھ گئے۔ ٹینیسن نے اُسے دیوار کی طرف پھینکا۔ وہ دیوار سے لگ کر گرنے لگا تو ٹینیسن نے اُس کے پیٹ میں گھونسہ مارا۔ نوکر نے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھے اور دوہرا ہو گیا، پھر اس کے گھٹنے فرش پر لگے اور پھر اُس کا ماتھا فرش پر جا لگا۔ وہ چند سیکنڈ سجدے کی پوزیشن میں رہا پھر ایک پہلو پر لڑھک گیا۔

نوکر کے چہرے کا رنگ لاش جیسا ہو گیا تھا۔ اتنے زوردار گھونسے سے اُس کی تلی پھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ ٹینیسن نے اُس کے سر کے بال مٹھی میں لے کر کھینچے اور اسے اُٹھا کر بنچ پر بٹھایا۔ اُس کے چہرے پر کرب اور اذیت کا تاثر تھا۔

"سچ بولو"——ٹینیسن نے اُسے اُردو میں کہا پھر پوچھا——"تمہارا صاحب رات کتنے بجے آیا تھا؟"

اُس نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید مجھے ہندوستانی سمجھ کر مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے اُسے وہی باتیں کہیں جو خانسامے کو اُس کا بیان لینے سے پہلے کہی تھیں۔ اُسے بھی کہا کہ اُس کا صاحب بڑے لمبے عرصے کے لئے جیل میں جا رہا ہے۔

"اپنے صاحب کو مت خوش کرو" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے اُسے کہا ـــــ "اپنے خدا کو خوش کرو۔"

ایک ہی گھونسے سے اس بے چارے نوکر کو خدا یاد آ گیا۔ کچھ میری باتوں کا اثر تھا کہ اُس نے اپنے صاحب کو دل سے اتار دیا اور سچ بولنے پر آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ آدھی رات کے بہت بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے گیٹ کھولا اور اپنے صاحب عمران علی کو پیدل دیکھا۔ گیٹ کی بتی جل رہی تھی۔ نوکر عمران کے کپڑے خون میں لت پت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اندر جا کر عمران علی نے قمیض اُتار کر فرش پر پھینک دی۔

گھر میں فسٹ ایڈ ڈریسنگ کی چیزیں موجود تھیں جو نوکر اُٹھا لایا۔ عمران علی نے نوکر سے زخم اور بازو سے خون دھلوایا اور اسی سے دوائیاں وغیرہ لگوا کر پٹی بندھوا لی۔ یہ تو میں پہلے بتا چکا ہوں کہ عمران علی کی بیوی اپنے گھر گئی ہوتی تھی۔

نوکر کے بیان کے مطابق عمران علی نے اُسے خانساما کو بلا لانے کے لئے بھیجا پھر انہیں بیان یاد کراتے۔ خانساماں شاید یہ بتانا بھول گیا تھا کہ عمران علی نے اُسے اور نوکر کو دس دس روپے دیئے تھے جو اُس وقت اچھی خاصی رقم ہوتی تھی۔

اس نوکر سے پوچھ گچھ کے دوران پتہ چلا کہ یہ عمران علی کا خاص آدمی ہے بلکہ اُس کا قابلِ اعتماد راز دان ہے۔ اُس کی زبان کھل گئی تھی اور وہ پردے اُٹھاتا چلا جا رہا تھا لیکن جو راز ہم لینا چاہتے تھے وہ اُس کے پاس نہیں تھا۔ مثلاً ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ عمران کی وجنتی کے ساتھ دوستی کا مقصد کیا ہے۔ کیا یہ جاسوسی کرتے یا سیاسی فیلڈ میں درپردہ کام کرتے ہیں یا یہ محض دوستی ہے؟

"ہمارا صاحب عیاش آدمی ہے" ـــــ نوکر نے کہا ـــــ "جب بیگم یہاں ہوتی ہے تو صاحب گھر میں ٹھیک رہتا ہے اور بیگم میکے چلی جاتے تو صاحب گھر میں شراب بھی پیتا ہے اور کوٹھی میں عورتیں بھی آتی ہیں۔ رات

کو جشن بھی ہوتے ہیں۔"

"کیا نئی سے نئی عورتیں آتی ہیں؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "وہ کون ہیں؟"

"ایک ہندو لڑکی زیادہ آتی ہے" ـــــ نوکر نے جواب دیا ـــــ "اُس کا نام وجنتی ہے۔ اُس کے باپ کا نام لالہ جے پال ہے۔ یہ لڑکی زیادہ تر دن کے وقت آتی ہے۔ اگر شام کے بعد آئے تو جلدی چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ صاحب کی خاص دوستی ہے .... ایک کرسچن لڑکی کے ساتھ بھی صاحب کی خاص دوستی تھی۔ وہ ہسپتال میں مر گئی تھی۔ اُس کا خاوند اس جرم میں پکڑا گیا تھا کہ اُس نے اپنی بیوی کو زہر دیا ہے۔"

"اُس کا نام ڈیزی تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"جی حضور!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "ڈیزی کبھی کبھی آتی تھی۔"

میں نے اور ٹینیسن نے مزید کریدنا شروع کر دیا۔ یہ بڑا طویل اور تکلیف دہ طریقہ تفتیش تھا۔ نوکر ہمارے ساتھ تعاون کرتا رہا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ ہم جو بھید لینا چاہتے تھے اس کا ہمیں ہلکا سا اشارہ بھی نہیں مل رہا تھا۔ آخر ٹینیسن کے ذہن میں ایک سوال آ گیا۔

"کیا کبھی ایسا ہوا ہے" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے اُس سے پوچھا ـــــ "کہ تمہارے صاحب نے تمہیں کبھی بند لفافہ دیا ہو کہ یہ وجنتی کو یا کسی اور کو دے آؤ؟"

"یہ کام تو میں کرتا ہی رہتا تھا" ـــــ نوکر نے جواب دیا ـــــ "پندرہ بیس دنوں بعد عمران صاحب مجھے ایک بند لفافہ دے کر کہتا تھا کہ وجنتی کو دے آؤ۔ ساتھ یہ ضرور کہتا تھا کہ وجنتی نہ ہو تو کسی اور کو نہ دینا۔ یہ بھی کہتا تھا کہ لفافہ کوئی اور نہ دیکھے۔

وجنتی کے علاوہ نوکر نے دو اور آدمیوں کے نام لئے جنہیں عمران علی کوئی پیغام لفافے میں بند کر کے نوکر کے ہاتھ بھیجا کرتا تھا۔ نوکر نے ان

کے ایڈریس بھی بتا دیئے۔

"کیا ڈیزی کو بھی وہ اسی طرح کبھی کبھار لفافہ بھیجا کرتا تھا؟"

"نہیں صاحب بہادر!" — نوکر نے جواب دیا — "اُس کے گھر صاحب نے مجھے کبھی نہیں بھیجا تھا" — وہ چپ ہو کر سوچ میں پڑ گیا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چند سیکنڈ بعد کہنے لگا — "میرا خیال ہے کہ ڈیزی اور عمران صاحب میں ناراضگی ہو گئی تھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ڈیزی کی موت سے بیس پچیس دن پہلے ایک شام ڈیزی صاحب کے پاس آئی تھی اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ جانے کا انداز ایسا تھا جیسے غصے یا ناراضگی میں ہو۔"

"تم نے ان کی باتیں نہیں سُنی تھیں؟" — میں نے پوچھا۔

"جب کوئی مہمان آتا ہے تو صاحب مجھے چائے یا پانی کے لئے کہتا ہے" — نوکر نے جواب دیا — "ڈیزی اور دجنتی کی تو صاحب بہت خاطر تواضع کیا کرتا تھا۔ میں جب چائے یا شراب وغیرہ لے کر کمرے میں جاتا تو ان کی ایک آدھ بات سن لیا کرتا تھا لیکن جس روز ڈیزی آخر بار آئی اُس روز صاحب نے مجھے کچھ لانے کے لئے اندر بلایا ہی نہیں۔ پھر ڈیزی جلدی چلی گئی تو مجھے خیال آیا کہ ان میں کچھ اَن بن ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ڈیزی کوٹھی میں نہیں آئی۔"

"تمہیں ان بن کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی؟"

"نہیں صاحب بہادر!"

سرگوشی سرگوشی میں

عمران علی کسی اور جرم کا مجرم تھا یا نہیں، اُس کا یہ جرم واضح اور قابلِ یقین شہادت سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ گاڑی خود چلا رہا تھا اور اُس نے ایک سائیکل سوار کو ٹکر ماری اور وہاں سے فرار ہو گیا پھر اُس نے ایک

کار کی چوری کی جھوٹی رپورٹ تھانے میں درج کرائی۔

اب اسی کی باری تھی۔ اسے پیٹ میں لے کر اقبالی کرانا تھا۔ میرے دماغ میں ایک بات آگئی۔ میں نے ٹینیسن کو بتائی۔ اُس نے تجویز پسند کی۔ پہلے تو ہم نے سوچا تھا کہ رات ہو گئی ہے، اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جائیں گے اور رات ڈیڑھ دو بجے عمران سے تفتیش شروع کریں گے۔ یہ وقت تفتیش کے لئے بڑا اچھا ہوتا ہے۔ ملزم یا مُشتبہ پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اُسے کچھ دیر پہلے مرغن کھانا کھلایا جاتا ہے جس سے اُسے نیند زیادہ آتی ہے۔ میرے ذہن میں ایک بات آگئی تھی اس لئے ہم نے اُسے آزمانا بہتر سمجھا اور عمران علی کو اندر بلایا۔

یہ میرا کمرہ تھا۔ ٹیلیفون میز پر رکھا تھا۔ انسپکٹر ٹینیسن میری سکیم کے مطابق یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ وہ ایک گھنٹے بعد واپس آئے گا۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے انگریزوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

"عمران بھائی!" — میں نے کہا — "اگر یہ کیس صرف میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں تم جیسے صاحبِ حیثیت آدمی کو اتنا پریشان نہ کرتا۔ اس بندر کی اولاد گورے انسپکٹر کی موجودگی میں میرا زور نہیں چلتا۔ تم میرے مسلمان بھائی ہو۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن جہاں کہیں کوئی انگریز یا ہندو افسر موجود ہے وہ کسی مسلمان کو مسلمان کی مدد نہیں کرنے دے گا۔ یہ کافر مسلمانوں کے دشمن ہیں۔"

"ملک صاحب!" — عمران علی نے میری طرف جُھک کر رازداری کے لہجے میں کہا — "آپ میری مدد کریں، باقی مجھ پر چھوڑیں۔ خدا کی قسم جھولی بھر دوں گا۔ اگر آپ کی نوکری چلی جاتی ہے تو میں آپ کو تاحیات موجودہ تنخواہ آپ کے گھر بھیجتا رہوں گا۔ اگر آپ کہیں گے تو حساب کر کے تمام رقم یکمشت دے دوں گا۔"

"یہ حساب کر لیں گے" — میں نے کہا — "تم اپنے والد صاحب یا بیوی کو اطلاع تو نہیں دے سکے ہو گے کہ تم سی آئی اے کے پاس ہو؟"

"اطلاع کیسے دیتا ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "مہلت ہی کہاں ملی ہے۔"

"یہ گورا چلا گیا ہے" — میں نے کہا — "فون یہ رکھا ہے۔ میں باہر نکل جاتا ہوں۔ تم جلدی جلدی جسے فون کرنا چاہتے ہو کر لو۔ دیر نہ لگانا .... میں باہر سے دروازہ بند کر دوں گا کیونکہ یہ دستور ہے .... اور بات ذرا آہستہ کرنا۔ آواز کمرے سے باہر نہ جائے۔"

میں کمرے سے نکل گیا۔ باہر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ انسپکٹر ٹینیسن کہیں چلا نہیں گیا تھا۔ وہیں ایک کمرے میں بیٹھا تھا یہ ہمارے ڈی ایس پی میڈیوز کا کمرہ تھا۔ میرا ٹیلیفون ڈی ایس پی کے ٹیلیفون سے ملا ہوا تھا۔ باہر سے کسی کا فون آتا تو میرے فون کی گھنٹی بجتی تھی۔ ریسیور ایک ہیڈ کانسٹیبل اُٹھاتا تھا۔ فون اگر میرا ہوتا تو وہ ریسیور مجھے دے دیتا اور اگر ڈی ایس پی کا ہوتا تو میرے فون پر جو بٹن لگا ہوا تھا، وہ دبا کر ڈی ایس پی سے پوچھ لیا جاتا کہ فلاں کا فون ہے، وہ بات کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ بات کرنا چاہتا تو میرا فون اُس کے فون پر ڈائریکٹ کرا دیا جاتا تھا۔

عمران علی کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ میں نے فون ڈی ایس پی کے فون سے ملا دیا ہے۔ میں ٹینیسن کے ساتھ ڈی ایس پی کے کمرے میں جا بیٹھا اور اس کا ریسیور اُٹھا کر اپنے کان سے لگا لیا۔ ٹینیسن نے اپنا کان ریسیور کے ساتھ لگا لیا۔ کسی فون کی رِنگ جا رہی تھی۔ کسی نے فون اُٹھایا۔ ہم دونوں سُن رہے تھے۔

"ہیلو!" — یہ زنانہ آواز تھی۔

"وجنتی!" — یہ عمران علی کی آواز تھی — "وجنتی .... زیادہ وقت نہیں ہے۔ معاملہ بگڑتا دکھائی دے رہا ہے۔ میں اس وقت سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں شاملِ تفتیش ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے نوکروں سے پولیس نے صحیح بیان لے لئے ہیں۔"

"تم نہیں جانتے معاملہ کیوں بگڑا ہے" — وجنتی نے کہا — "جسے تم نے ٹکر ماری تھی میں ہسپتال میں جا کر معلوم کر آتی ہوں۔"

"زیادہ باتیں نہ کرو وجنتی!" — عمران نے کہا — "میں چوری چوری فون کر رہا ہوں۔ ایک مسلمان انسپکٹر کو ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس کے ساتھ وہی انگریز انسپکٹر ہے جس نے ڈیزی کے قتل کی تفتیش کی تھی اور مسلمان انسپکٹر بھی وہی ہے۔ وہ آ نہ جائے۔ میری بات سنو۔ فون پر کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا۔ اپنے دوستوں سے کہو کہ غائب ہو جائیں — PUSH THEM UNDERGROUND — .... پتا جی کو بتا دینا۔"

"تم نے کوئی بیان دیا ہے؟" — وجنتی نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" — عمران نے جواب دیا — "اب میرا بیان لیں گے۔"

"سنبھل کر" — وجنتی نے کہا — "سوچ کر .... اپنے ابا جان کو اطلاع دے دی ہے؟"

"نہیں" — عمران نے جواب دیا — "کسی اور سے انہیں فون کرا دینا۔ خود نہ کرنا۔"

"ہاں عمران! سنو" — وجنتی نے کہا — "تم نے مجھے فون کیا تھا۔ پھر بند کیوں کر دیا تھا؟"

"کب؟" — عمران نے پوچھا — "کس وقت؟"

"آج!" — وجنتی نے جواب دیا اور اُسے وقت بتا کر کہا — "میں نے تمہیں فون کیا تو تمہارا نوکر بولا۔ اُس نے بتایا کہ تم باہر نکل گئے ہو .... اب خیال آتا ہے کہ وہ آواز تمہارے نوکر کی نہیں لگتی تھی۔ اس کے شاید ایک گھنٹے بعد تمہارا فون آیا۔ تم نے سرگوشی میں میرا اور اپنا نام لیا۔"

"اوہ!" — عمران نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا — "تم نے کوئی خاص بات تو نہیں کی تھی؟"

"نہیں" — وجنتی نے کہا — "میں نے اتنا کہا تھا کہ میں نے تمہارے گھر فون کیا پھر تمہارے دفتر فون کیا .... پھر تمہاری گاڑی کے متعلق پوچھا تھا لیکن تم نے فون بند کر دیا۔"

"میں نے اس وقت تمہیں فون نہیں کیا تھا" — عمران نے پہلے سے زیادہ گھبراہٹ سے کہا — "مجھے اُس وقت سی آئی اے ہیڈکوارٹر میں لے آتے تھے اور گھر میں میرے فون پر پولیس کا ایک آدمی بیٹھا ہُوا ہے۔ وہاں فون نہ کرنا۔"

"اُس نے مجھ سے میرا فون نمبر پوچھا تھا" — وجنتی نے کہا — "میں نے بتا دیا۔"

"اب محتاط رہنا" — عمران نے کہا — "فون پر کوئی بات نہ کرنا .... اچھا۔ اب فون بند کرتا ہوں۔"

"وِش یُو گڈ لک عمران!" — وجنتی نے کہا اور فون بند ہو گیا۔

اس کے بعد عمران نے کسی اور کو فون نہ کیا۔ میں اور انسپکٹر ٹینیسن کچھ دیر انتظار کرتے رہے پھر میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

عزّت کی قیمت — ایک سگریٹ

"کر لیا فون عمران بھائی!" — میں نے پوچھا۔

"ملک صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ!" — اُس نے کہا — "والد صاحب کو اطلاع دینی تھی کہ میں یہاں ہُوں۔"

"وہ پریشان تو بہت ہوں گے" — میں نے کہا۔

"پریشان تو ہونا ہی تھا" — اُس نے کہا اور مُسکرا کر کہنے لگا — "اُن کی پریشانی کا حل آپ کے پاس ہے۔ میرے والد صاحب تو مجھ سے بھی زیادہ فیاض ہیں۔ احسان کا صِلہ بادشاہوں کی طرح دیتے ہیں۔"

"عمران بھائی!" — میں نے کہا — "میں احسان کرنے میں فیاض

ہوں لیکن اپنے جُرم کو تسلیم تو کرو۔ مجھے کچھ بتاؤ گے تو ہی میں تمہاری نجات کا کوئی ذریعہ نکال سکوں گا۔"

"میری باتوں پر اعتبار کر لیں ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "انسپکٹر ٹینیسن سے پوچھیں کہ وہ کیا مانگتا ہے۔ میں کیش دوں گا۔"

"تم نے کوئی جُرم ہی نہیں کیا تو ہم تم سے پیسے کیوں لیں؟" — میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ایک بات ذہن میں آ گئی۔ میں نے کہا — "انسپکٹر ٹینیسن سے یہ نہ پوچھنا کہ وہ کیا مانگتا ہے۔ اگر اُس نے کہہ دیا کہ وجنتی کے ساتھ میری دوستی کرا دو تو پھر کیا کرو گے؟"

"وجنتی؟" — اُس نے حیران سا ہو کر پوچھا — "وجنتی کون ہے؟"

"اُس ہندو لڑکی کو بھول گئے ہو جو ڈیزی کے قتل کے کیس میں شاملِ تفتیش ہوتی تھی؟" — میں نے کہا — "وہ جوڈیتھ کی دوست ہے۔"

"اُس کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے؟" — عمران علی نے کہا — "میں تو اُسے جانتا ہی نہیں۔"

"عمران علی!" — میں نے کہا — "تم ایسی جگہ بیٹھے ہوتے ہو جہاں تمہارے مُنہ سے نکلا ہُوا صرف ایک لفظ تمہیں ساری عمر کے لئے جیل میں بند کرا سکتا ہے۔ سوچ کر بات کرو۔ زبان پر آتے ہوئے لفظ کو مُنہ سے نکالنے سے پہلے دس دفعہ سوچو۔"

میں اُسے اُٹھا کر باہر لے گیا اور اُس کمرے میں بٹھا دیا جہاں پہلے بٹھایا ہُوا تھا۔ وہاں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل موجود تھے۔ میں انسپکٹر ٹینیسن کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ عمران علی رشوت پیش کرنے پر آ گیا ہے۔ ہم نے آپس میں تبادلۂ خیالات کیا اور یہ طے کیا کہ ٹیلیفون ایکسچینج میں وجنتی کے فون پر اپنا ایک آدمی بٹھایا جائے۔ ابھی ٹیلیفون ٹیپ کرنے کا موجودہ انتظام عام نہیں ہُوا تھا۔ انگلینڈ میں یہ رائج ہو چکا تھا۔ انڈیا میں یہ صرف دو محکموں کو دیا گیا تھا — انٹیلی جنس اور سی آئی اے — معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ اس کا استعمال سی آئی اے

نے بہت محدود رکھا تھا۔

ہم نے دوسرا یہ انتظام کرنے کا فیصلہ کیا کہ وجنتی اور اُس کے باپ کی اور عمران علی کی تمام ڈاک متعلقہ ڈاک خانوں سے ہمارے پاس آئے اور ہم سنسر کر کے اسے سپردِ ڈاک کریں۔ پاکستان میں آجکل بھی ڈاک سنسر ہوتی ہے لیکن ہر خط سنسر نہیں کیا جاتا۔ چند ایک خطوط کھولے جاتے ہیں۔ جنگِ عظیم کے دوران ڈاک کا سنسر بڑا ہی سخت تھا۔ بعض مشتبہ افراد کی ڈاک باقاعدگی سے سنسر ہوتی تھی۔ یہ انٹیلی جنس اور سی آئی اے کا کام تھا۔

یہ فیصلے کر کے میں اور انسپکٹر ٹینیسن رات اڑھائی بجے واپس آنے کے لئے اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے گئے۔ میں نے غسل کیا، کھانا کھایا، آرام کیا اور اڑھائی بجے اپنے ہیڈ کوارٹر میں جا پہنچا۔ چند منٹ بعد انسپکٹر ٹینیسن آگیا۔ عمران علی جو اپنی دنیا کا شہزادہ تھا، بغیر بستر کے ایک چارپائی پر سویا ہوا تھا۔ دروازے میں بغیر وردی ایک کانسٹیبل سٹول پر بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اُٹھا۔ میں نے اس سے عمران علی کے متعلق پوچھا۔ ملزم کانسٹیبلوں کے ساتھ باتیں کیا کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی بات تفتیشی افسروں کے کام آجاتی ہے۔

"سگریٹ مانگتا رہا ہے" — کانسٹیبل نے بتایا — "اس کے اپنے سگریٹ شام کو ہی ختم ہو گئے تھے۔ کسی نے اسے سگریٹ نہیں دیا۔ پیسے دیتا تھا کہ سگریٹ لا دو۔ ہم نے اسے بتایا کہ ملزم کو سگریٹ دینا جرم ہے۔ یہ ایک سگریٹ کے پانچ روپے دیتا تھا۔ پھر اس نے ایک سگریٹ کے دس روپے پیش کئے لیکن کسی نے اسے سگریٹ نہ دیا۔"

عمران علی تو شرابی تھا اور سگریٹ نوشی کا بھی عادی تھا۔ نشہ سگریٹ کا ہو یا ہیروئن کا، اس سے ٹوٹا ہوا انسان اپنا ایمان اور اپنی عزت بھی دے دیا کرتا ہے۔ نشہ کردار کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ شخصیت میں

ذرا سی بھی پختگی نہیں رہتی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ یہی کمزوری عمران علی میں ہے۔ انسپکٹر ٹینیسن نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ اسے ہمارے پاس بھیج دو۔

ہم اپنے کمرے میں چلے گئے اور چار پانچ منٹ بعد عمران علی کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ اُس پر نیند کا غلبہ تو تھا ہی لیکن وہ شراب اور سگریٹ کے نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اُس کے جسم سے جان تو جھوٹ نے بھی نکالی ہوئی تھی۔ میں اُس کی نفسیاتی حالت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

"عمران بھائی!" — میں نے اُسے کہا — "ہو تو تم بھی پکے ڈھیٹ لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ڈھیٹ پن ہمارا پیشہ ہے اور ہمیں اسی کی تنخواہ ملتی ہے۔ تم جیت نہیں سکتے۔ ہمارا تو یہی کام ہے۔"

"آپ چاہتے کیا ہیں؟" — اُس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کوئی نیند میں بول رہا ہو۔

"میرے یار!" — میں نے کہا — "سیدھے سادے اور بڑے آسان دو تین سوال ہیں جن کے جواب پر ائمری پاس بھی دے سکتا ہے۔ تم تو ماشاءاللہ عقلمند آدمی ہو۔ ہمارے ہر سوال کا جواب 'ہاں' ہے۔ میں نے جواب بتا کر تمہاری مشکل آسان کر دی ہے۔ اب یوں کرو کہ ہمارے ہر سوال کے جواب میں اپنی زبان سے ہاں کہہ دو۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وجنتی کے ساتھ تمہاری بڑی گہری دوستی ہے۔ دوسرا سوال یہ کہ تم اپنی گاڑی خود چلا رہے تھے اور تم نے اُس سائیکل سوار کو ٹکر ماری اور ٹکر اس لئے ماری کہ تم اُسے جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ کہو یہ ٹھیک ہے یا غلط؟"

"یہ غلط ہے کہ میں اُس غریب کو جان سے مار دینا چاہتا تھا" — اُس نے یکلخت بیدار ہو کر اور کرسی سے آگے ہو کر پُرزور طریقے سے کہا — "میں تو اُسے جانتا تک نہ تھا۔ میری اُس غریب کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔"

"تم بھی اُسے جانتے تھے، ہم بھی اُسے جانتے ہیں" — میں نے کہا

—"اُس کا نام شعیب ہے اور یہ اُسی ہسپتال کا ڈسپنسر ہے جس ہسپتال میں تمہاری دوست ڈیزی زہر خورانی سے قتل کی گئی تھی اور یہ ڈسپنسر اس کیس میں نہایت اہم گواہ تھا۔ اُس کیس کے ساتھ تمہارا تعلق بھی تھا۔ انتقام کی وجہ موجود تھی جو تم خود بتاؤ گے۔ تم نے اُسے قتل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ...."

عمران علی اچھل اچھل کر اور میز پر ہاتھ مار مار کر کہنے لگا کہ اُسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ سائیکل سوار کون ہے۔

"بہر حال، تمہارا شکریہ"— میں نے کہا —"تم نے ہمارے کم از کم ایک سوال کا جواب تو دے دیا ہے۔ وہ یہ کہ گاڑی تم خود چلا رہے تھے۔"

"ہاں"— اُس کا جوش و خروش یکلخت سرد پڑ گیا اور اُس نے یوں 'ہاں' کہی جیسے اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکل گئی ہو۔ دبی سی زبان میں بولا —"گاڑی میں خود چلا رہا تھا۔"

"اس ایک سوال کے صحیح جواب میں ہمارے دوسرے سوالوں کے جواب بھی مل گئے ہیں"— انسپکٹر ٹینیسن نے کہا —"تم رات دس بجے اپنے گھر نہیں پہنچے تھے۔ تم نے نوکروں کو غلط بیان دینے کو کہا تھا جو انہوں نے دیا۔ یہاں آکر وہ صحیح بیان دے چکے ہیں۔ تمہاری گاڑی چوری نہیں ہوئی تھی اور تم نے گاڑی کی چوری کی جھوٹی رپورٹ تھانے میں درج کرائی۔"

محبت سلطنت اور دولت

"بات یہ ہے انسپکٹر ٹینیسن!"— عمران علی نے آہ بھر کر کہا —"میری جگہ میری پوزیشن کا کوئی بھی آدمی ہوتا تو وہ بھی شاید ایسے ہی کرتا جیسے میں نے کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ علاقہ ویران ہے، سڑک پر کوئی ٹریفک نہیں، کوئی دیکھنے والا نہیں تو بہتر ہے کہ یہاں سے بھاگو، لیکن پیچھے سے جیپ آگئی۔ میں نے گاڑی اور تیز کی۔ گھر کی طرف مڑنے کی بجائے میں دوسری طرف مڑ گیا۔ میرا خیال تھا کہ پچھلی گاڑی کسی اور طرف نکل جائے گی، لیکن وہ میرے پیچھے رہی۔ میں غیر آباد علاقے کی طرف چلا گیا۔ مجھ پر گولیاں چلنے لگیں۔ تب میں ڈرا۔ پھر ایک گولی پچھلے شیشے سے گزر کر میرے بائیں بازو کو کاٹتی ہوئی ڈیش بورڈ میں جا لگی۔ میں نے گاڑی کچے پر ڈال دی پھر ایکسی لیٹر سے پاؤں اُٹھا لیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو میں دروازہ کھول کر گاڑی سے نکل گیا۔ آگے علاقہ کٹا پھٹا تھا اور اندھیرا بھی تھا۔ مجھ پر گولیاں چلیں لیکن میں بچ کر نکل گیا۔"

"اب تو تمہیں یہ بھی مان لینا چاہیئے کہ خون آلود رومال تمہارا ہے"— انسپکٹر ٹینیسن نے کہا۔

"ہاں"— اُس نے جواب دیا —"میں نے جیب سے رومال نکال کر زخم پر رکھا۔ جب میں دُور نکل گیا تو زخم پر رومال باندھ دیا۔ گانٹھ ایک ہاتھ اور دانتوں سے لگائی۔ میں دوڑتا جا رہا تھا۔ دل پر گھبراہٹ تھی پکڑے جانے کا ڈر بھی تھا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ رومال کہیں گر پڑا ہے۔"

"اتنی دُور سے تم گھر تک کس طرح پہنچے تھے؟"

"یہ تو خدا کی مدد تھی"— اُس نے جواب دیا —"آگے سڑک آئی۔ میں چلتا رہا۔ اچانک ایک تانگہ خالی آتا نظر آیا۔ اُسے کہا کہ ڈاکوؤں نے مجھے راستے میں روک کر گاڑی چھین لی ہے اور مجھے زخمی کر دیا ہے۔ مجھے گھر پہنچا دو۔ تانگے والے نے دُگنے تگنے پیسے مانگے۔ میں نے اُسے کہا کہ گھوڑا تیز دوڑاؤ اور مجھے جلدی گھر پہنچاؤ۔ اُس نے مجھے گھر پہنچا دیا۔"

اُس نے اپنے جُرم کی کہانی سُنا دی۔ یہ بھی تسلیم کیا کہ اُس نے نوکروں کو وہ بیان زبانی یاد کرا دیا تھا جو اُنہوں نے ہمیں کوٹھی میں دیا تھا۔ اُس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اُس کے دماغ میں یہ ترکیب آئی کہ کار کی چوری کی رپورٹ لکھوا دی۔

"اب وجنتی کی بات کرو" ـــــ میں نے کہا۔

"ملک صاحب!" ـــــ اُس نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا ـــــ "مَیں وجنتی کو نہیں جانتا۔ ڈیزی کے قتل کے کیس میں اُس کا نام سُنا اور اُسے دیکھا بھی تھا، لیکن اُس کے ساتھ کبھی ہیلو ہیلو بھی نہیں ہوئی۔"

"یہ تو ہم مانتے ہیں کہ ہیلو ہیلو نہیں ہوئی" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اُس کے ساتھ تمہارے تعلقات ہیلو ہیلو سے زیادہ گہرے ہیں۔"

"تم وجنتی کے تعلقات سے کیوں انکار کر رہے ہو؟" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

ہم اسے بتا سکتے تھے کہ اُس نے ہمارے ٹیلیفون پر وجنتی کے ساتھ بات کی ہے لیکن اس قسم کی تفتیش کے طریقۂ کار کے مطابق ابھی اس کا موقعہ نہیں تھا۔ ہم نے وجنتی کو بھی شاملِ تفتیش کرنا تھا اور اگر یہ جاسوسی کا چکر تھا تو اِن کے پورے رِنگ کو پکڑنا تھا۔ عمران نے انسپکٹر ٹینیسن کے سوال کے جواب میں کہا کہ وجنتی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں تو وہ کیسے مان لے۔

اگر ہماری تفتیش کار اور سائیکل کے ایکسیڈنٹ اور کار چوری کی جھوٹی رپورٹ تک محدود ہوتی تو ہمارا کام ختم ہو گیا تھا لیکن وجنتی کے ساتھ عمران علی نے ہمارے فون پر جو باتیں کی تھیں وہ کسی اور جرم کی نشاندہی کرتی تھیں۔ عمران کا وجنتی کے ساتھ تعلقات سے انکار کرنا اس نامعلوم جُرم کی نشاندہی کو پختہ کرتا تھا۔

ہم نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اُسے کہا کہ عمران علی کو حوالات میں بند کر دے۔ عمران بہت تڑپا لیکن اُسے باقاعدہ طور پر گرفتار کرنے کا بڑا مضبوط جواز مل گیا تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ اُسے تفتیش اور حراست کا پورا مزہ چکھایا جائے۔ ہیڈ کانسٹیبل اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔

"مسٹر ملک!" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے کہا ـــــ "میں اس لڑکی کو یہاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔"

"انگریز عورتوں سے زیادہ خوبصورت تو نہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "آپ کے ملک میں تو ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت عورت موجود ہے۔"

"نہیں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "تم ہندوستانی لوگ سفید رنگ کو خوبصورتی کہتے ہو۔ خوبصورتی کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ میں نے اس لڑکی میں دیکھی ہے۔ میں ڈیزی کے قتل کے کیس کو ذہن سے اُتار چکا ہوں لیکن وجنتی کو نہیں بھول سکا۔"

"اُسے شاملِ تفتیش تو کرنا ہی ہے" ـــــ میں نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ "وہ تمہارے رحم و کرم پر ہو گی۔ ذرا سا ڈراؤ گے تو رشوت کے طور پر اپنے آپ کو پیش کر دے گی۔"

"نہیں مسٹر ملک!" ـــــ اُس نے ایسی سنجیدگی سے کہا کہ میں حیران رہ گیا ـــــ "میں ایسا نہیں سوچ رہا۔ اس لڑکی کے متعلق تو میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"معلوم ہوتا ہے انسپکٹر ٹینیسن!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کہ تم اُس کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہو۔"

"میں محسوس کچھ ایسا ہی کر رہا ہوں" ـــــ اُس نے کہا۔

"اگر وہ جاپان یا جرمنی کی جاسوس نکلی تو برٹش ایمپائر کی سلامتی کو محبت پر قربان کر دو گے؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "میرا خیال ہے کہ تم اتنی بڑی قربانی نہیں دو گے۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ـــــ "اپنی ایمپائر پر اپنی محبت کو قربان کر دوں گا۔"

اُسے یہی کہنا چاہیئے تھا۔ انگریز اپنی بادشاہی کے نام پر مرمٹتے تھے۔ میں البتہ حیران ہو رہا تھا کہ ایک ہندو لڑکی کے متعلق ایک انگریز اتنا زیادہ سنجیدہ تھا۔

ان باتوں کے بعد ہم نے تفتیش کو آگے بڑھانے کے پروگرام پر غور کیا اور صبح کی روشنی سفید ہونے لگی۔

بیٹیوں کی خاطر

ہم دونوں شیو، غسل اور ناشتے کے لئے روانہ ہونے ہی والے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا تو کسی نے کہا کہ وہ انسپکٹر ٹینیسن کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے ریسیور دے دیا۔

"بیان لینا شروع کر دو ڈاکٹر!" — ٹینیسن نے کہا — "ٹھیک ہے .... اُسے ہوش میں رکھنے کی کوشش کرو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

"مسٹر ملک!" — انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے کہا — "مضروب سائیکل سوار ہوش میں آگیا ہے۔ ڈاکٹر بیان لے رہا ہے۔ جلدی چلو۔"

ہم دوڑتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچے اور ڈرائیور سے کہا کہ انتہائی رفتار سے چلے اور ہمیں ہسپتال پہنچائے۔

ہم ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے تو ہسپتال کے ڈاکٹر انچارج کو ایک وارڈ کے برآمدے میں دیکھا۔ ہم لمبے لمبے اور تیز تیز قدم اُٹھاتے اُس تک پہنچے۔ اُس کے چہرے پر مایوسی تھی۔

"وہ مر گیا ہے" — ڈاکٹر نے کہا۔

"کیا آپ بیان نہیں لے سکے؟" — میں نے پوچھا — "کیا وہ بیہوشی میں ہی ختم ہو گیا ہے؟"

"بس اتنا سا بیان لے سکا ہوں" — ڈاکٹر نے اپنا پیڈ ہمارے آگے کرتے ہوئے کہا — "پڑھ لیں۔"

ہم ڈاکٹر کے کمرے میں جا بیٹھے۔ ڈاکٹر نے اُس نرس کو بھی بلا لیا تھا جو اُس وقت ڈسپنسر شعیب کے کمرے میں تھی۔ ڈسپنسر کو الگ کمرے میں رکھا گیا تھا جس کے دروازے پر ایک کانسٹیبل رائفل لئے کھڑا رہتا تھا۔ اُسے بھی ڈاکٹر نے بُلا لیا تھا۔ نرس اور کانسٹیبل کو بلانے کی وجہ یہ تھی کہ نرس اُس وقت مضروب کو دیکھنے آئی تھی۔ مضروب نے آنکھیں

کھولیں۔ نرس نے اُس سے پوچھا کہ وہ ہوش میں ہے؟ اُس نے سر ہلا کر بتایا کہ وہ ہوش میں ہے۔

نرس نے باہر جا کر ہسپتال کے ایک ملازم کو یہ کہہ کر ڈاکٹر کے گھر کو دوڑا دیا کہ شعیب ہوش میں آگیا ہے۔ نرس کمرے میں آگئی۔ شعیب کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نرس کو معلوم تھا کہ اس کا بیان لینا ہے۔ نرس نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ نرس نے کانسٹیبل کو بھی اندر بلا لیا اور اُسے کہا کہ وہ بھی سُنے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ مضروب نے ڈاکٹر کے آنے تک جو الفاظ کہے وہ کانسٹیبل نے بھی سُنے تھے، اس لئے ڈاکٹر نے اس کانسٹیبل کو بھی بُلا لیا تھا۔ کانسٹیبل کی اب اُس کمرے پر پہرہ دینے کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی کیونکہ مضروب اب مقتول کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

ہم نے ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھ کر پہلے نرس کا بیان لیا۔ اُس نے ملازم کو ڈاکٹر کی طرف دوڑایا۔ ڈاکٹر کی رہائش ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں ہی تھی۔ مضروب نے نرس اور کانسٹیبل کے ساتھ بات شروع کر دی۔

"مجھے خدا نے سزا دی ہے" — مضروب ڈسپنسر شعیب نے کہا — "میں نے اسی ہسپتال میں ایک مریضہ کو زہریلی دوائی کا انجکشن دیا تھا۔"

"تم ڈیزی کی بات کر رہے ہو؟" — نرس نے اس سے پوچھا۔

"ہاں!" — شعیب نے کہا — "میں نے چار بیٹیوں کے لئے اتنا بڑا گناہ کیا تھا لیکن میرے گناہ کی سزا میری بیٹیوں کو ملے گی۔ میں نے اُن کی خاطر پانچ سو روپوں کے عوض ایک جوان لڑکی کی جان لی تھی۔ میں سزا سے بچ گیا لیکن خدا نے پکڑ لیا اور مجھے سزائے موت دے دی۔"

"تم زندہ رہو گے شعیب!" — نرس نے کہا — "تم اتنے دِنوں بعد ہوش میں آگئے ہو تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"نہیں!" — اُس نے سر ہلا کر کہا — "میں ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ میری کہانی ختم ہو گئی ہے۔"

نرس نے ہمیں بتایا کہ شعیب بول نہیں سکتا تھا۔ ایک دو لفظ منہ سے

نکالتا تھا تو پندرہ بیس سیکنڈ خاموش رہتا تھا۔ بڑی ہی مشکل سے وہ ایک جُملہ پورا کرتا تھا۔ اُس کی بات پوری یکسوئی سے سُننے سے سمجھ میں آتی تھی۔

کانسٹیبل سے ہم نے بیان لیا تو اُس کا یہی بیان تھا۔ نرس اور کانسٹیبل مضروب کی باتیں سُن رہے تھے کہ ڈاکٹر رات کے کپڑوں میں ہی آگیا۔ اُس نے مریض کی نبض دیکھی پھر دل پر سٹیتھوسکوپ رکھی پھر پیڈ اور قلم لے کر مضروب کے پاس بیٹھ گیا۔ مضروب شعیب نے وہی بات دہرائی جو وہ نرس اور کانسٹیبل سے کہہ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے یہ باتیں لکھنی شروع کر دیں۔ اتنا بولنے سے اُس کا سانس اُکھڑ گیا تھا۔

"تم نے ڈیزی کو زہر کا انجکشن کیوں دیا تھا؟" — ڈاکٹر نے شعیب سے پوچھا۔

"پیسے کی خاطر" — شعیب نے کہا — "اپنی بیٹیوں کی خاطر"

"پیسے کس نے دیئے تھے؟" — ڈاکٹر نے پوچھا۔

شعیب کی آنکھیں بند ہونے لگیں جیسے وہ پھر بیہوش ہو گیا ہو۔ پاس ایک ڈسپنسر کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں انجکشن لگانے والی سرنج تھی جس میں دوائی بھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر ڈسپنسر نے شعیب کے بازو میں انجکشن لگا دیا۔ شعیب نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"پیسے کس نے دیئے تھے شعیب؟" — ڈاکٹر نے پوچھا۔

شعیب نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اُس کی نبض دیکھی۔ اُس کی حالت بگڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ شعیب میں بات کرنے کی طاقت ختم ہو رہی تھی اس لئے اُس نے شعیب کی مدد کرنی شروع کر دی۔

"ڈینئیل نے پیسے دیئے تھے؟" — ڈاکٹر نے اُس کی مدد کرتے ہُوئے پوچھا۔

"نہیں!" — شعیب نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"کیا تم نے اپنی مرضی سے یہ کام کیا تھا؟" — ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں!" — شعیب نے ایک بار پھر سر ہلا کر جواب دیا۔

"کس کے کہنے پر یہ کام کیا تھا؟" — ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔

ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ شعیب نے ہونٹ ہلائے۔ ڈاکٹر نے اپنا کان اُس کے مُنہ کے ساتھ لگایا لیکن اُس کے مُنہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ ڈاکٹر نے اپنا کان اُس کے مُنہ سے ہٹا کر ایک بار پھر اپنا سوال دُہرایا۔ شعیب کا مُنہ کُھلا اور اس قسم کی آواز نکلی — "آ.... آ" — اُس کے ہونٹ بند ہو گئے اور اس قسم کی آواز سنائی دی جیسے "مم مم" کہہ رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھیں پوری کی پوری کُھل گئیں۔ اُس نے ایک خراٹا لیا پھر اُس کی آخری سانس بھی نکل گئی اور اُس کے جسم کو مُردہ کر گئی۔

اور نشہ اُتر گیا

ڈاکٹر نے ڈسپنسر شعیب کا تحریری بیان جو ڈاکٹر کے ہاتھ کا لکھا ہُوا تھا، ہمیں دے دیا۔ اس پر ڈاکٹر کے اپنے دستخط تھے۔ گواہوں کے طور پر اس پر نرس نے، ڈیوٹی کانسٹیبل اور ایک ڈاکٹر نے جو اُس وقت ڈیوٹی پر تھا دستخط کئے تھے۔

اس نرمی بیان سے ہمیں صرف یہ حاصل ہُوا کہ ڈیزی کے قتل میں ڈینئیل کا ہاتھ نہیں تھا۔ اُسے ڈسپنسر شعیب نے زہریلی دوائی کا انجکشن دیا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ کسی اور نے شعیب کو پانچ سَو روپے دے کر اُس کے ہاتھوں ڈیزی کو مروایا تھا۔ پانچ سَو روپے اُس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ آج کے حساب کے مطابق یہ رقم کم و بیش دس ہزار روپے بنتی ہے۔

میں اور انسپکٹر ٹینیسن ڈسپنسر کے آخری اُدھورے اُدھورے الفاظ کو DECIPHER کرنے بیٹھ گئے۔ اُس نے کہا تھا — "آ، آ .... مم مم" — انسپکٹر ٹینیسن کا خیال تھا کہ شعیب عامر کہنا چاہتا تھا۔

"پھر عامر نہ کہو" ـــــ میں نے کہا ـــــ "عمران کہو۔"

"لیکن عمران کے پاس ڈیزی کو مروانے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا ـــــ "ان کی تو آپس میں محبت چل رہی تھی۔"

"یاد کرو انسپکٹر ٹینیسن!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "عمران کے نوکر نے کہا تھا کہ عمران اور ڈیزی کے درمیان کسی بات پر ناچاقی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر یہ پتہ چل جائے کہ اس ناچاقی کی وجہ کیا تھی تو ہم کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ وجہ اتنی شدید تھی جو قتل تک نوبت پہنچا سکتی تھی۔"

ڈیزی کے قتل کو زیرِ بحث لانا بیکار تھا کیونکہ ہائیکورٹ ڈینیل کو قتل کے الزام سے بری کر چکی تھی۔ یہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ڈینیل سیشن کورٹ سے نہیں تو ہائی کورٹ سے بری ہو جائے گا۔ یہ انسپکٹر ٹینیسن کی جلد بازی تھی کہ اس نے اس وقت ڈینیل پر ہی توجہ مرکوز کر لی تھی اور میرے روکنے کے باوجود صرف واقعاتی شہادت پر مقدمہ کھڑا کر دیا تھا۔

وہ تو جو ہوا سو ہو گیا، ہمیں اس کیس پر جو عدالتوں کی فائلوں میں دفن ہو چکا تھا، سر نہیں کھپانا چاہیئے تھا لیکن ہمیں ڈی ایس پی میڈیوز کی طرف سے جو بریفنگ ملی تھی اس پر عمل درآمد کے لئے ڈیزی کے قتل کی وجہ معلوم کرنا ضروری تھا۔ ہم نے ذہن میں یہ شبہ رکھا ہوا تھا کہ ایسا تو نہیں کہ ڈیزی جاسوسی کے رنگ میں شامل تھی۔ ابھی تو یہ بھی دیکھنا تھا کہ جاسوسی کا کوئی رنگ تھا بھی یا نہیں۔

ہم "آ۔آ اور مم مم" کا معمہ حل نہ کر سکے۔ مجھے توقع تھی کہ تفتیش کے کسی نہ کسی مرحلے میں یہ معمہ خود ہی حل ہو جائے گا۔

ہم نے ڈاکٹر، نرس، ڈیوٹی کانسٹیبل اور ڈیوٹی ڈاکٹر کے نام گواہوں کی فہرست میں لکھ لئے اور انہیں کچھ ہدایات دے کر ہم ہسپتال سے چلے آئے۔ میں نے راستے میں انسپکٹر ٹینیسن سے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ ڈینیل کو ہم نے بلاوجہ پریشان کیا۔

"بھول جاؤ اسے مسٹر ملک!" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ـــــ "اتنا جذباتی ہو کر تفتیش نہیں کی جا سکتی۔"

"جذبات کی بات نہیں انسپکٹر ٹینیسن!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ ہمیں اس تفتیش میں ڈینیل کی ضرورت بھی پیش آ سکتی ہے، لیکن ہم نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس سے وہ ہمارے ساتھ ذرا سا بھی تعاون نہیں کرے گا۔"

"وہ تعاون کرے گا" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ "میں نے اسے اتنا ہی کہہ دیا، ہیلو ماتی انگلش برادر، تو وہ اپنی پتلون اتار کر میرے آگے رکھ دے گا۔ میں اسے ایک سیکنڈ میں انگریز بنا دوں گا .... تم بھول گئے ہو کہ عمران اور ڈینیل کی آپس میں دشمنی ہے۔ اسے رقابت کہہ لو۔ یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ عمران کے بھی وجنتی کے ساتھ تعلقات ہیں۔"

میں یہ پہلے ڈیزی کے قتل کے سلسلے میں سنا چکا ہوں کہ عمران نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی تھی کہ ڈیزی کا قاتل ڈینیل ہے۔ مجھے یوں نظر آ رہا تھا کہ ڈینیل کو شاملِ تفتیش کرنا پڑے گا اور اس سے ہمیں عمران علی کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم ہو جائے گا۔

اس روز ہم نے یہ کارروائی کی کہ اپنے سٹاف کے ایک ذہین آدمی کو ٹیلی فون ایکسچینج میں وجنتی کے ٹیلی فون نمبر پر بٹھا دیا اور ایک آدمی کو متعلقہ ڈاک خانے میں وجنتی اور اس کے باپ جے پال کی تمام ڈاک سنسر کرنے کے لئے بٹھا دیا۔ اسے ہم نے یہ ہدایت دی کہ جس خط پر اسے ذرا سا شک ہو تو وہ خط ہمیں دے دے۔ اس کارروائی کے دوران ہمیں خیال آیا کہ عمران علی کی ڈاک بھی سنسر ہونی چاہیئے۔ اس کا ہم نے یہ انتظام کیا کہ اس کی کوٹھی میں ایک ہیڈ کانسٹیبل کو پہلے ہی بٹھا رکھا تھا۔ ایک اور کانسٹیبل اس کی بدلی کرتا تھا یعنی یہ دونوں پانچ پانچ گھنٹے عمران کی کوٹھی میں رہتے تھے اور عمران علی ہماری حوالات میں بند تھا۔ ہم نے ان ہیڈ کانسٹیبلوں کو کہا کہ عمران علی کی جتنی ڈاک گھر کے پتے پر آتے

وہ ہمیں پہنچا دیا کریں۔

میں آپ کو یہ نہیں بتا رہا کہ یہ انتظامات کرنے کے لئے کیا کیا دفتری کارروائیاں ہوتی ہیں۔ ان سے آپ کو دلچسپی بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ میں آپ کو صرف کہانی سُنا رہا ہوں۔

شام چار بجے کے بعد ہم اپنی حوالات تک گئے۔ ہمیں دیکھ کر عمران علی سلاخوں والے دروازے کے ساتھ آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ آہ وزاری کر رہا تھا کہ اُسے بلاوجہ پریشان کیا جا رہا ہے۔

"ہم تمہیں یہ بتانے آئے ہیں کہ شعیب مر گیا ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اب تم ایکسیڈنٹ کے مجرم نہیں بلکہ قتل کے مجرم ہو۔ تم نے اس ڈسپنسر کو عمداً قتل کیا ہے۔ تم اتنا کرو کہ قتل کی وجہ بتا دو اور یہ بھی بتاؤ کہ وجنتی کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں پھر ہم تمہیں ایک معزز مہمان کی صورت میں یہاں رکھیں گے۔"

"ملک صاحب!" ـــــ اُس نے سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکال کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور روتی ہوئی سی آواز میں کہا ـــــ "میں نے آپ سے ایک بات کہی تھی۔ اس پر آپ کیوں غور نہیں کرتے!"

"ہماری بات تم مانتے نہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اسی لئے ہم تمہاری بات پر غور نہیں کر رہے۔"

"میرے پاس بتانے کے لئے اور کچھ بھی نہیں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "آپ میری پیشکش پر غور کریں۔ آپ کیوں یقین نہیں کرتے کہ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ سائیکل سوار کون تھا۔"

"تم خود کہتے ہو کہ سڑک خالی تھی" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ـــــ "اور وہ سڑک تنگ بھی نہیں۔ جادٹے کی جگہ پر موڑ بھی نہیں اور وہاں کوئی اور سڑک یا گلی بھی اس کشادہ سڑک سے نہیں ملتی کہ یہ بدقسمت سائیکل سوار اچانک تمہاری تیز رفتار گاڑی کے آگے آگیا ہو ... یہ کہو کہ تم شراب کے

نشے میں بدمست تھے اور گاڑی تمہارے قابو میں نہیں تھی۔"

"انسپکٹر ٹینیسن!" ـــــ عمران علی نے کہا ـــــ "میں اپنی اس حالت کو چھپانا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ نشے کی حالت میں ڈرائیونگ جرم ہے اور اس کی سزا ایکسیڈنٹ کی صورت میں زیادہ ہے۔ میں شراب کے نشے میں تھا۔ نشہ اُس وقت اُترا جب مجھے پتہ چلا کہ ایک گاڑی میرے تعاقب میں ہے، اور جب مجھ پر گولیاں چلیں تو نشہ بالکل ہی غائب ہو گیا۔"

"کہاں پی تھی؟"

اُس نے مغربی طرز کے ایک شراب خانے کا نام لیا۔ وہاں یہ معلوم کرنا کہ یہ شخص فلاں رات اس شراب خانے میں آیا تھا یا نہیں، آسان نہیں تھا۔ وہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ نئی دِلی میں انگریزوں کے علاوہ امریکہ، آسٹریلیا اور دیگر اتحادی ملکوں کے فوجی افسر ہجوم کی صورت میں موجود تھے۔ یہ سب اسی قسم کے شراب خانوں میں شامیں گزارتے تھے۔ ان کے علاوہ ہندوستانی امیرزادے بھی وہاں جاتے تھے۔

ہم نے عمران علی کو سلاخوں کے پیچھے کھڑا رہنے دیا اور وہاں سے آگئے۔

دل سوز جگر سوز

رات کو ہم ٹیلیفون ایکسچینج میں اپنے آدمی سے رپورٹ لینے گئے۔ اُس نے بتایا کہ وجنتی کا ایک ہی فون آیا تھا۔ کوئی ڈینیل بول رہا تھا۔ وہ اُردو اور انگریزی ملا کر بولتا تھا۔ ہمارے اِس آدمی نے وجنتی اور ڈینیل کی جو گفتگو سنائی وہ کچھ اس طرح تھی کہ ڈینیل جذباتی انداز میں محبت کی باتیں کرتا تھا اور وجنتی اُسے اسی انداز میں جواب دیتی تھی، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وجنتی کا مطالبہ کچھ ایسا ہے جو ڈینیل پورا نہیں کر سکتا یا کرنا نہیں چاہتا۔

"میں نے تمہاری محبت کی خاطر اپنی بیوی کے ساتھ بگاڑ پیدا کیا" ـــــ

ڈینئیل نے کہا ــــ "پھر اُس کے مرنے پر مَیں نے جو مصیبت اُٹھائی اور دو سال جس اذیت میں گزارے وہ تم جانتی ہو۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں ڈیزی کا قاتل نہیں تھا۔ تم نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کرنے سے گریز کر رہی ہو۔"

"مَیں گریز نہیں کر رہی ڈین!" ــــ وجنتی نے کہا ــــ "مَیں نے تمہیں کہا تھا کہ میرا مذہب قبول کر لو۔ میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ ہندو ہو کر تمہیں اور کیا کیا فائدے ملیں گے۔ تم مانتے ہی نہیں۔"

"تم میرا مذہب کیوں قبول نہیں کر لیتیں؟" ــــ ڈینئیل نے پوچھا۔

"میں تمہیں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ اس میں بھی تمہارا ہی فائدہ ہے" ــــ وجنتی نے کہا ــــ "اگر میں تمہارے مذہب میں آگئی تو ہندو تمہارے لئے مصیبت کھڑی کر دیں گے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میرے پتاجی کانگریس کے لیڈر ہیں۔ وہ ایسا ہنگامہ کھڑا کریں گے کہ تم بھاگ جاؤ گے۔"

"وجنتی!" ــــ ڈینئیل نے کہا ــــ "یہ بات بھی نہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھ سے پرے پرے ہٹنے کی کوشش کر رہی ہو۔ تمہیں یہ افسوس تو ضرور ہو گا کہ تمہارا دوست عمران گرفتار ہو گیا ہے۔ اُس نے تمہارے اور میرے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا کی ہیں، تم وہ رفع کرنے کا بھی مجھے موقع نہیں دیتیں۔"

"سب سے بڑی غلط فہمی تو تم نے خود ہی پیدا کر رکھی ہے" ــــ وجنتی نے کہا ــــ "میں تمہیں کئی بار یقین دلانے کی کوشش کر چکی ہوں کہ عمران کے ساتھ میرے تعلقات تم جیسے نہیں۔"

"پھر تم اُس سے قطع تعلق کیوں نہیں کر لیتیں؟" ــــ ڈینئیل نے کہا ــــ "وجنتی! آج میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تم کچھ اور چاہتی ہو۔ تمہارا مطالبہ کچھ اور ہے۔ تم کھل کر بتا کیوں نہیں دیتیں کہ میرے ساتھ شادی کس شرط پر کرو گی؟ مذہب کا نام نہ لینا۔"

"چلو جانے دو" ــــ وجنتی نے کہا ــــ "بتاؤ کب ملو گے۔

کہاں ملو گے؟"

"وہیں آجانا" ــــ ڈینئیل نے جواب دیا ــــ "اُسی وقت۔"

اس کے بعد وجنتی اور اُس کے باپ کے کئی فون آئے اور اُدھر سے یہی جواب ملتا رہا کہ وہ گھر نہیں ہیں۔ وجنتی کے گھر سے ایک دو فون کہیں کئے گئے جو عام سی قسم کے تھے۔ ہمارے اس آدمی نے بتایا کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے فون ڈیڈ ہو گیا ہو۔

میرا اور انسپکٹر ٹیشین کا خیال تھا کہ وجنتی اور اُس کے باپ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ اُن کے فون سُنے جا رہے ہیں اور اب کسی اور فون پر بات کرتے ہوں گے۔ اگلا دن گزر گیا۔ شام کو ایکسچینج سے معلوم کرایا تو رپورٹ ملی کہ گذشتہ رات اور پورے دن کے دوران صرف تین مرتبہ بات ہوئی۔ صرف ایک فون وجنتی کا تھا۔ وہ کسی عورت کا تھا۔ دو تین منٹ گپ شپ ہوئی۔ دو فون وجنتی کی ماں کے لئے تھے۔ یہ بھی عورتوں کی گپ بازی تھی۔

ہمیں اپنی ایک کوتاہی کا احساس ہُوا۔ وجنتی کا باپ لالہ جے پال دِلّی کا بہت بڑا تاجر تھا۔ وہ چائے اور کافی کی دو برٹش کمپنیوں کا سول ایجنٹ تھا۔ اس کے علاوہ بھی اُس کا کوئی کاروبار تھا۔ اُس کا اپنا دفتر تھا۔ ہمیں پہلے خیال نہ آیا کہ اُس کے دفتر میں فون ہو گا اور اُس کی کالیں بھی سنی جائیں۔ اب ہم نے ایکسچینج سے یہ نمبر لیا تو پتہ چلا کہ اس لائن میں کوئی خرابی ہے جو کچھ دنوں بعد ٹھیک ہو گی۔

دو دن اور گزر گئے۔ وجنتی کے فون کی رپورٹیں ملتی رہیں لیکن کوئی ایک بھی کال مشکوک نہیں تھی۔

ڈاک خانے میں وجنتی اور اُس کے باپ کی ڈاک سنسر ہو رہی تھی۔ عمران علی کے گھر میں آنے والی ڈاک ہمارے پاس پہنچتی رہی۔ آخر ایک روز عمران علی کی ڈاک میں ایک خط ایسا ملا جو ہمارے لئے غور طلب تھا۔ یہ خط کلکتہ سے لکھا گیا تھا۔ اُردو میں تھا اور نیچے "ایل ڈی سوز" نام لکھا ہُوا تھا۔ اس کی تحریر مجھے آج بھی زبانی یاد ہے۔ تاریخ اور دن یاد نہیں۔

"ڈیر عمران! آداب۔

اُس سے ملاقات ہوگئی ہے۔ وہ مشکل سے کلکتہ تک پہنچا ہے۔ اُس نے بہت کام کیا ہے۔

میں (فلاں تاریخ) پنجاب میل سے آرہا ہوں۔ سٹیشن پر نہ آنا میں خود آپ کے گھر پہنچ جاؤں گا۔

وجنتی کو بھی اطلاع دے رہا ہوں۔

ایل ڈی سوز"

اُسی روز ڈاک خانے میں بیٹھا ہُوا ہمارا آدمی ہمارے پاس آیا اور وجنتی کے نام ایک خط ہمیں دیا۔ وجنتی کے نام خطوط کم ہی آتے تھے۔ زیادہ تر ڈاک اُس کے باپ کی ہوتی تھی۔ ان میں بیشتر خطوط کاروباری اور کچھ سیاسی تھے۔ ان میں مشکوک خط ایک بھی نہیں تھا۔ ہمارے آدمی کو وجنتی کا یہ خط مشکوک لگا تو یہ ہمارے پاس لے آیا۔ یہ ایل ڈی سوز کا تھا۔ اس میں اُس نے اپنے دِلّی پہنچنے کی تاریخ اور گاڑی لکھی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ اُس نے عمران علی کو اطلاع دے دی ہے اور وہ اُس کے گھر خود ہی پہنچ جائے گا۔

یہ ہماری عقل اور ذہانت کا امتحان تھا۔ اس ایل ڈی سوز کو ہم نے پکڑنا نہیں تھا بلکہ اُس کا پیچھا کرنا تھا کہ یہ کہاں کہاں جاتا ہے۔ ہم نے پہلے تو یہ سوچا کہ جس روز یہ شخص آرہا ہے اُس روز ہم عمران علی کی کوٹھی میں جا کر بیٹھ جائیں اور یہ جب وہاں آئے تو اسے پکڑ لیں۔

انسپکٹر ٹینیسن کی عقل زیادہ دُور تک چلی گئی۔ اُس نے کہا کہ وجنتی کو یہ خط پوسٹ کر دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتی ہے۔ وہ یہ کرے گی کہ خود ریلوے سٹیشن پر چلی جائے گی اور کلکتہ سے آنے والے ایل ڈی سوز کو عمران کی کوٹھی میں جانے سے روکے گی اور اُسے اپنے گھر یا کہیں اور لے جائے گی۔

"اگر ہم نے اس شخص کو پکڑ لیا تو اس کے تمام ساتھی زیرِ زمین چلے

جائیں گے" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "مجھے یہ کیس انٹیلی جنس کا معلوم ہوتا ہے لیکن پہلے ہم کچھ شہادت اکٹھی کر لیں۔ یہ خط وجنتی کو پوسٹ کر دیتے ہیں پھر دیکھتے ہیں وہ کیا کرتی ہے۔"

ہم نے وجنتی کے نام یہ خط اسی طرح لفافے میں ڈال کر لفافہ بند کیا اور ڈاک خانے میں اپنے آدمی کو دے دیا کہ اسے بھیج دے۔

فولاد کو پگھلا لیا

سی آئی اے اور سی آئی ڈی کے ذرائع بڑے وسیع ہوتے ہیں۔ ایل ڈی سوز کے آنے میں ابھی چار دن باقی تھے۔ ہم نے ایک انتظام یہ کیا کہ اپنے ایک آدمی کو یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا کہ وجنتی کی کار کو اچھی طرح پہچان لے اور اُس کا نمبر دیکھ لے اور اگر اُن کا ڈرائیور ہے تو اُسے بھی پہچان لے۔ عمران علی کی کوٹھی میں جو ہیڈ کانسٹیبل ڈیوٹی پر تھے، اُنہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ فلاں تاریخ شام کے بعد کوئی آدمی عمران علی کے گھر آئے تو اُسے وہیں روک کر ہمیں اطلاع دے دیں۔

اس طرح کے کچھ اور ضروری انتظامات کر لئے۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ یہ آدمی پُراسرار کردار تھا اور ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ عمران علی کو ہم نے حوالات میں ہی بند رکھا اور قانون کے مطابق اُس کا ریمانڈ لے لیا۔

پنجاب میل کلکتہ سے لاہور اور لاہور سے کلکتہ تک چلتی تھی۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ریل گاڑیاں لیٹ نہیں ہُوا کرتی تھیں۔ جنگِ عظیم کے دوران ایک تو گاڑیوں میں رَش بے تحاشہ ہو گیا تھا، دوسرے گاڑیاں لیٹ چلنے لگی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اُس روز پنجاب میل شام گہری ہونے کے بعد آتی تھی۔ مجھے صحیح وقت یاد نہیں رہا۔ ہمارا ایک بڑا ہی ذہین ہیڈ کانسٹیبل ریلوے سٹیشن کے باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ایک کار میں گیا تھا جو ایک

ڈی ایس پی کی تھی۔ ڈرائیور بھی ڈی ایس پی کا تھا۔

کار وہیں پارک کی گئی جہاں دوسری کاریں پارک ہو رہی تھیں۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اُس دَور میں کاریں بہت کم ہُوا کرتی تھیں۔ کوئی امیر کبیر آدمی کار رکھتا تھا۔

اس ہیڈ کانسٹیبل نے وجنتی کے باپ کی کار پہلے ہی دیکھ لی تھی اور اس کا نمبر بھی یاد کر لیا تھا۔ اُس نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ یہ کار وجنتی یا اُس کا باپ خود چلاتے ہیں۔ انہوں نے ڈرائیور نہیں رکھا۔ ہمارے ہیڈ کانسٹیبل نے اپنی کار پارک کی اور وجنتی کی کار کا انتظار کرنے لگا۔ اُسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ وجنتی کی کار آگئی لیکن اُس میں وجنتی نہیں تھی نہ اُس کا باپ تھا۔ کوئی اور ہی آدمی تھا جس کی عمر تیس پینتیس سال کے درمیان تھی۔ وہ کار کا دروازہ لاک کر کے سٹیشن کے اندر چلا گیا۔ ہمارا ہیڈ کانسٹیبل آگے جا کر گیٹ کے پاس کھڑا ہو گیا جہاں سے مسافر باہر آتے ہیں۔

گاڑی آئی اور مسافر باہر آنے لگے۔ اس ہجوم میں وجنتی کی کار لانے والا آدمی باہر آیا پھر ایک آدمی جس کے ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا، کار والے کے ساتھ ہو گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل ان کے ساتھ ساتھ اس طرح چلنے لگا کہ دوسری طرف دیکھتا رہا جیسے اُسے اِن دو آدمیوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اُس کے کان اِن دونوں کی طرف تھے۔

"یہ آپ نے بہت بُری سنائی" — کلکتہ سے آنے والا آدمی کہہ رہا تھا۔

"عمران اتنا کچا تو نہیں" — وجنتی کی گاڑی لانے والے نے کہا — "وہ ایکسیڈنٹ سے آگے کوئی بات مُنہ سے نہیں نکالے گا۔"

"کچا تو نہیں" — کلکتے والے نے کہا — "لیکن سی آئی اے اور سی آئی ڈی والے فولاد کو بھی پگھلا لیا کرتے ہیں۔"

"ہمیں بہت ہی محتاط رہنا پڑے گا۔"

اِن دونوں کے مکالمے کے الفاظ کچھ اسی قسم کے تھے جو مجھے یاد

ہیں۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان دونوں کی باتوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ عمران علی کسی اور جُرم کا مجرم بھی ہے اور اس جُرم میں پورا ایک گروہ شامل ہے۔ یہ جُرم جاسوسی ہی ہو سکتا تھا۔ انسپکٹر ٹینیسن نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ انٹیلی جنس کا کیس تھا۔ ہم نے شہادت فراہم کر کے انٹیلی جنس کے حوالے کرنی تھی۔

یہ دونوں آدمی وجنتی کی گاڑی میں بیٹھے۔ انہوں نے آپس میں جو باتیں کی تھیں، ان میں سے کچھ ہمارے ہیڈ کانسٹیبل نے سُنی تھیں۔ ان سے ہمارے شکوک کو مزید تقویت ملتی تھی۔ اُن کی گاڑی وہاں سے نکلی تو ہمارا ہیڈ کانسٹیبل اپنی کار میں اُن کے پیچھے چل پڑا۔ اُس نے محفوظ فاصلہ رکھا تھا۔ وجنتی کی گاڑی اُس کے گھر کی طرف جانے کی بجائے کسی اور طرف جا رہی تھی۔ یہ گاڑی نئی دِلّی اور پرانی دِلّی کے درمیان درمیانے سے ایک ہوٹل کے سامنے رُک گئی۔

ہیڈ کانسٹیبل اپنی کار کو آگے لے گیا اور ایک جگہ کار رکوا کر کار سے باہر آگیا۔ وہ ہوٹل کی طرف آیا۔ اُسے نظر آ رہا تھا کہ وجنتی کی گاڑی سے دونوں آدمی نکل کر ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے۔ معاملہ بالکل صاف تھا۔ کلکتے سے آنے والے آدمی کو اس ہوٹل میں ٹھہرایا جا رہا تھا۔ اس آدمی نے عمران علی کے گھر میں قیام کرنا تھا۔ ہم نے اس آدمی کا وہ خط جو وجنتی کے نام آیا تھا، پڑھ کر وجنتی کو بذریعہ ڈاک بھجوا دیا تھا۔ یہ احتیاطی تدبیر وجنتی یا اُس کے باپ نے سوچی تھی کہ اس شخص کو عمران علی کے گھر نہ جانے دیا جائے اور کہیں اور ٹھہرایا جائے، چنانچہ اُسے اس ہوٹل میں ٹھہرایا جا رہا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل سڑک کے پار ہوٹل کے بالمقابل کھڑا دیکھتا رہا۔ کم و بیش ایک گھنٹے بعد دونوں آدمی باہر نکلے اور کار میں بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ڈرائیور کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ڈرائیور بھی پولیس کا آدمی تھا اور ہیڈ کانسٹیبل کے مشن کو جانتا تھا اس لئے اُس کی

نظر ہیڈ کانسٹیبل پر تھی اور وہ اشارے کا منتظر تھا۔ اشارہ ملتے ہی وہ کار لے کر ہیڈ کانسٹیبل تک پہنچ گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل کار میں بیٹھا اور وجنتی کی کار کے تعاقب میں چلا گیا۔

وجنتی کی کار اُس کی کوٹھی کے سامنے جا رُکی۔ دونوں آدمی کار سے نکلے اور کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اپنی گاڑی دُور ہی روک لی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی اور پیچھے لے جائے تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ ہیڈ کانسٹیبل ایک جگہ چھپ کر دیکھتا رہا۔

یہ دونوں آدمی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد کوٹھی سے نکلے۔ وجنتی اور ایک اور آدمی ان کے ساتھ باہر آئے۔ وجنتی کا باپ بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر آیا۔ وجنتی اور اُس کے ساتھ والا آدمی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے دوسرے دو آدمی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور کار چل پڑی۔ کار وجنتی چلا رہی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل اپنی کار ان کے پیچھے لے گیا۔

وجنتی کی کار پہاڑ گنج کے علاقے میں ایک جگہ رُکی۔ پہاڑ گنج ہندوؤں کی آبادی کا علاقہ تھا۔ سیاسی ہنگامے اسی علاقے سے اُٹھا کرتے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل اپنی گاڑی ذرا آہستہ کروا کے وجنتی کی گاڑی کے قریب سے گزر گیا۔ کچھ آگے جا کر اُس نے اپنی گاڑی ایک کُشادہ گلی میں کروا کے رُکوا لی اور خود گاڑی سے نکل آیا۔ اُس نے وہ مکان اچھی طرح دیکھ لیا جس کے سامنے وجنتی کی گاڑی رُکی تھی اور کلکتے سے آنے والے آدمی کو سٹیشن سے لانے والا آدمی اُس مکان میں داخل ہُوا تھا۔ وجنتی گاڑی واپس لے چلی۔

ہیڈ کانسٹیبل اپنی کار میں بیٹھا اور گلی سے کار نکلوا کر وجنتی کی گاڑی کے پیچھے چلا گیا۔

وجنتی کی کار اُسی ہوٹل کے سامنے جا رُکی۔ کلکتے سے آنے والا آدمی کار سے نکلا اور ہوٹل میں چلا گیا۔ کار چل پڑی۔ ہیڈ کانسٹیبل کی کار کچھ دُور پیچھے پیچھے تھی۔ وجنتی کی کار اُس کی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ ہیڈ کانسٹیبل اپنی

کار آگے لے گیا۔ آگے جا کر اُس نے کار رُکوائی اور کار میں بیٹھے بیٹھے پیچھے دیکھا وہ آدمی جو وجنتی کی کوٹھی سے نکل کر اُس کے ساتھ گیا اور اُس کے ساتھ ہی واپس آیا تھا، کوٹھی سے نکلا اور ایک طرف پیدل چل پڑا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے جب اپنی یہ تمام رپورٹ ہمیں دی تھی تو ہمیں خیال آیا تھا کہ یہ آدمی وجنتی کا ایسکارٹ تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اپنی کار پیچھے کو موڑی اور اس آدمی کے قریب کار رُکوا لی۔ رات کے بارہ بجے سے کچھ زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ وہ علاقہ بالکل سنسان اور ویران تھا۔ یہی ایک آدمی اس علاقے میں اکیلا جاتا نظر آتا تھا۔

"آپ نے کہاں جانا ہے؟" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کار اُس کے قریب رُکوا کر پوچھا۔

اُس آدمی نے بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

"آیئے، بیٹھ جایئے" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کار کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا —— "ہم بھی اُسی طرف جا رہے ہیں۔ آپ کو آپ کے گھر کے قریب اُتار دیں گے۔"

وہ آدمی کار میں بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔ یہ آدمی بار بار ہیڈ کانسٹیبل کا شکریہ ادا کرتا تھا۔

"یہ کونسی ہمارے باپ کی کار ہے صاحب!" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا —— "ہم تو نوکر چاکر ہیں۔ کار مالکوں کی ہے۔ تیل پٹرول اُن کا جل رہا ہے۔ آپ کو اپنے جیسا دیکھا تو سوچا کہ معلوم نہیں کہاں تک آپ کو پیدل جانا پڑے گا۔"

"اگر ہم ہندوستانیوں میں یہ محبت پیدا ہو جائے جو آپ کے دل میں ہے تو ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں" —— اُس آدمی نے کہا —— "ان انگریزوں کو ہندوستان سے بھاگنے کا راستہ نہ ملے۔"

ہیڈ کانسٹیبل کی رپورٹ یہ تھی کہ اس آدمی نے انقلابی قسم کی باتیں کیں۔ وہ تقریر کے انداز سے باتیں کرتا تھا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ کون لوگ

ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل اُسے اُس کے گھر تک لے گیا اور اُس کا مکان دیکھ آیا۔

"ہموار" کر دیا

یہ ہیڈ کانسٹیبل ہندوستانی عیسائی تھا۔ خصوصی ذہانت کا مالک تھا۔ ایکٹنگ ایسی کرتا تھا کہ اصل کا شک ہوتا تھا۔ اپنے محکمے اور اپنی ڈیوٹی کے ساتھ وفا کرنے والا قابلِ اعتماد آدمی تھا۔ میں جب آزادی کے وقت ہندوستان سے پاکستان آیا تھا اُس وقت وہ سب انسپکٹر ہو چکا تھا جس کی مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اپنے فرائض کے ساتھ وفا کرنے والے لوگ مجھے آج بھی اچھے لگتے ہیں۔ اُس کا نام فرانسس تھا اور میں اُسے مذاق سے فرانسیسی کہا کرتا تھا۔

اُس نے ہمیں رپورٹ دی جو مَیں اُوپر سنا چکا ہوں۔ ہم نے یہ رپورٹ ڈی ایس پی میڈیوز کو دی۔ اُس نے ہمیں کچھ ہدایات دیں اور یہ بھی کہا کہ ہمارے سامنے جیسی صورتِ حال آجائے ہم خود ہی تفتیش اور کارروائی کریں۔

مَیں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے ایک کارروائی یہ کی کہ ہیڈ کانسٹیبل فرانسس کو اُس ہوٹل کو اپنی نظر میں رکھنے پر مقرر کر دیا اور دو آدمیوں کو اُن دو گھروں پر مقرر کر دیا جن میں وجنتی کے دو آدمی رہتے تھے۔ ایک کو وجنتی اُس کے گھر چھوڑ آتی تھی اور دوسرے کو فرانسس اپنی کار میں لفٹ دے کر اُس کے گھر تک لے گیا تھا۔

ہمیں یاد تھا کہ عمران علی کے نوکر نے بتایا تھا کہ وہ کبھی کبھی دو جگہوں پر عمران علی کے لفافے دینے جایا کرتا تھا۔ ہم نے نوکر کو ہیڈ کانسٹیبل فرانسس کے ساتھ کیا اور کہا کہ نوکر یہ دونوں مکان دیکھ کر بتائے کہ وہ انہی دونوں گھروں میں لفافے لے جایا کرتا تھا یا وہ کوئی اور تھے۔ اگر یہ

نہیں تھے تو فرانسس کو وہ گھر دکھائے۔

دو گھنٹوں کے اندر ہمیں رپورٹ مل گئی۔ نوکر نے بتایا کہ یہی وہ مکان ہیں جہاں وہ عمران علی کے لفافے لے جایا کرتا تھا۔

ہم نے چھوٹے موٹے کچھ اور انتظامات بھی کئے۔ عمران علی کو ہم نے حوالات سے نکالا اور اپنے کمرے میں بٹھایا۔ وہ ابھی تک احتجاج کئے جا رہا تھا کہ اُسے بلاوجہ پریشان کر رہے ہیں۔

"تمہاری پریشانی آج ہی ختم ہو سکتی ہے" ـــــ میں نے اُسے کہا ـــــ "ایکسیڈنٹ کے متعلق تو تم بتا چکے ہو کہ تم نے ہی کیا ہے اور تم وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اب یہ بتا دو کہ ڈسپنسر شعیب کو تم نے کیوں ہلاک کیا ہے۔ یہ بھی بتا دو کہ وجنتی کے ساتھ تمہارے تعلقات جو خفیہ ہیں، کس نوعیت کے ہیں اور اب یہ بتاؤ تم اپنے نوکر کو کبھی کبھی ایک دو بند لفافے دیا کرتے تھے جو وہ دو آدمیوں تک پہنچاتا تھا، اِن لفافوں میں کیا لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ اِس سوال کا جواب بھی دے دو کہ ایل ڈی سوز کون ہے اور تمہارا اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔"

"میں کسی ایل ڈی سوز کو نہیں جانتا" ـــــ عمران علی نے احتجاج کے لہجے میں کہا۔

اُس نے کہہ تو دیا تھا کہ وہ ایل ڈی سوز کو نہیں جانتا لیکن اُس کے اندر جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی اسے وہ چھپا نہ سکا۔

"میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ شرافت سے ان سوالوں کے جواب دے دو" ـــــ میں نے کہا ـــــ "ایل ڈی سوز دِلّی میں آیا ہُوا ہے۔ ہم اُسے تمہارے پاس لے آئیں گے"۔

اُس کا ردِّ عمل تو ایسا تھا جیسے ابھی بے ہوش ہو جائے گا، لیکن وہ ہماری توقع کے خلاف بہت ہی ڈھیٹ تھا۔ میں اُسے بغیر ٹارچر کے اقبال جرم اور اپنے گروہ کی نشاندہی پر لانے کی کوشش میں تھا، لیکن انسپکٹر ٹینیسن نے اس طرح مداخلت کی کہ اُس کی گردن کے پیچھے ہاتھ رکھا اور بڑے

آرام سے اُسے اُٹھا کر باہر لے گیا۔ میں اُس کے پیچھے گیا۔ اُس نے عمران علی کو سی آئی اے کے ایک اے ایس آئی کے حوالے کر دیا اور کہا کہ اسے ذرا ہموار کرو۔

ہمارے ہاں ہموار بڑا خطرناک لفظ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُسے ایذا رسانی کی چکی میں ڈال دو۔ سی آئی اے، سی آئی ڈی اور انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹروں میں ایذا رسانی جسے انگریزی میں ٹارچر کہتے ہیں، مرحلہ وار عمل تھا۔ کچے اور کمزور ملزم پہلے مرحلے میں ہی ٹوٹ پھوٹ کر اقبال جرم اور مطلوبہ نشاندہیاں کر دیا کرتے تھے اور جو ذرا پختہ کار ہوتے تھے وہ دوسرے تیسرے مرحلے میں جا کر ٹوٹ جاتے تھے۔ میں اگر آپ کو ٹارچر کے ان تمام مرحلوں کی تفصیلات سناؤں تو کمزور دل قارئین سن کر ہی بیہوش ہو جائیں۔ ہم نے عمران علی کو اس طریقہ کار کے پہلے مرحلے میں ڈال دیا۔ اس ایذا رسانی کو ہتھڑ ڈگری بھی کہتے ہیں۔

ڈی ایس پی میڈیوز کی ہدایت کے مطابق میں اور انسپکٹر ٹینیسن انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر چلے گئے۔ وہاں ہمیں ایک انگریز کرنل کے حوالے کر دیا گیا۔ اُسے ہم نے ڈیزی کے قتل سے لے کر عمران علی کو ہتھڑ ڈگری میں ڈالنے تک کی روئیداد سنائی اور اُسے کہا کہ یہ انٹیلی جنس کا کیس ہے اور ہمیں بتایا جائے کہ ہم اس تفتیش کو آگے بڑھائیں یا پورا کیس انٹیلی جنس کو دے دیں یا سی آئی اے اور انٹیلی جنس مل کر اس گروہ کو زمین کے نیچے سے اُوپر لائیں۔

انگریز کرنل نے دو افسروں کو بلایا۔ دونوں میجر تھے۔ ایک انگریز تھا اور دوسرا ہندوستانی۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس کا نام بشیر الزمان تھا۔ پانچ چھ سال پہلے پولیس میں ڈائریکٹ اے ایس آئی بھرتی ہوا تھا۔ چند مہینے میرے ساتھ رہا تھا۔ اتنے عرصے بعد اب اُسے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں دیکھا۔ پتہ چلا کہ وہ جنگ شروع ہوتے ہی فوج میں لیفٹیننٹ بن کر آ گیا تھا۔ اُس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے اُسے انٹیلی جنس میں لے

لیا گیا تھا اور اب وہ میجر تھا۔

انگریز کرنل نے ان دونوں میجروں کو یہ کیس مختصراً سنایا۔ میجر بشیر الزمان نے پوچھا کہ اُن دو آدمیوں کے ایڈریس کیا ہیں۔ ہم نے اپنی فائل کھول کر انہیں ایڈریس بتائے۔

"سر!" — میجر بشیر الزمان نے اپنے کرنل سے کہا — "یہ دو آدمی پہلے ہی ہمارے ریکارڈ پر ہیں، لیکن ان کے خلاف کوئی ٹھوس شہادت ابھی نہیں ملی۔ وجنتی اور اُس کا باپ بھی ہمارے مشتبہوں کی فہرست میں ہیں۔ لال جے پال جو وجنتی کا باپ ہے، کانگریس کے درمیانے درجے کا لیڈر ہے اور وجنتی سوشل اور پولیٹیکل ورکر ہے، لیکن شک یہ ہے کہ ان کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان کی فائل لے آتا ہوں۔"

کرنل کے اشارے پر میجر بشیر الزمان ایک فائل لے آیا۔ کرنل نے فائل کی ورق گردانی کی اور اس کے بعد ہماری آپس میں گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ خاصی طویل بحث و تمحیص تھی جو میں ایک تو طوالت کی وجہ سے پوری کی پوری بیان نہیں کرنا چاہتا اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ٹیکنیکل قسم کی گفتگو تھی۔ کرنل نے ایک بار یہ کہا کہ وجنتی کو شاملِ تفتیش کر لیا جائے۔

"میں بھی یہی مشورہ دینا چاہتا تھا۔" — انسپکٹر ٹینیسن نے میز پر ہاتھ مار کر پُرزور طریقے سے کہا — "اگر ہم اس لڑکی کو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں زیرِ تفتیش رکھ لیں تو لڑکی ہونے کی وجہ سے ہم اسے آسانی سے توڑ سکتے ہیں۔"

میری تجویز کچھ اور تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ تفتیش انٹیلی جنس والے لے لیں اور ہم اُن کی صرف مدد کریں۔ وجہ یہ تھی کہ انٹیلی جنس کا طریقہ تفتیش کچھ اور طرح کا تھا۔ وہ ہم بھی اختیار کر سکتے تھے، لیکن انٹیلی جنس کے پاس پہلے ہی ان لوگوں کے متعلق کچھ انفارمیشن موجود تھی اس لئے اُن کے لئے آسانی تھی۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے کہ ایکسیڈنٹ کا کیس اپنے پاس رکھتے،

لیکن انسپکٹر ٹینیسن اسی پر زور دیتا رہا کہ وجنتی کو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں بلایا جائے۔ آخر یہ فیصلہ ہُوا کہ وجنتی کا چونکہ تعلق عمران علی کے ساتھ بنتا ہے اور یہ شُبہ بھی موجود ہے کہ ڈسپنسر شعیب کے قتل میں وجنتی کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے اس لئے اُسے جاسوسی کے شُبہے میں نہیں بلکہ قتل کے شُبہے میں شاملِ تفتیش کیا جا سکتا تھا۔ کرنل اور ٹینیسن کا مقصد یہ تھا کہ ہم اُسے اِس شُبہے میں اچھی طرح ہموار کر کے انٹیلی جنس کے حوالے کر دیں۔

یہ فیصلہ ٹھیک تھا یا نہیں، یہ الگ بات ہے۔ میں یہ سُنا رہا ہوں کہ یہ فیصلہ ہُوا کہ وجنتی کو ہم سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں لے آئیں۔ دوسرا فیصلہ یہ ہُوا کہ انٹیلی جنس کی تفتیشی ٹیم اپنی تفتیش فوری طور پر شروع کر دے گی۔

زندگی کی بہترین رومانی شام

ہم دونوں جب انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر سے واپس آ رہے تھے تو راستے میں تفتیش کے اس مرحلے کے متعلق باتیں کرتے آئے۔ ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وجنتی اور عمران علی کے متعلق مزید معلومات لینے کے لئے ڈینیئل کو بلایا جائے۔ یہ میں پہلے واضح کر چکا ہوں کہ ڈینیئل اور عمران علی میں ایسی رقابت تھی جو دشمنی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ میں آپ کو ایک بار پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ڈیزی کے قتل میں عمران علی نے ڈینیئل کو پھنسانے کی بے حد کوشش کی تھی۔ اب ہم ڈینیئل کو عمران علی کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے۔

اُسی شام ہم نے اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ڈینیئل کے گھر بھیجا اور اسے سی آئی اے ہیڈ کوارٹر آنے کے لئے کہا۔ ڈینیئل کو ہمارے خلاف ناراضگی تو تھی کہ ہم نے اُسے بلاوجہ قتل کا ملزم بنا دیا تھا، لیکن پولیس کی

طلبی کو وہ ٹال نہیں سکتا تھا۔ اگر ٹالتا تو ہم باوردی پولیس کو بھیج کر اُسے زیرِ حراست اپنے ہاں بلا سکتے تھے۔ شام سے کچھ پہلے وہ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں آ گیا۔ ہم اُس وقت اپنے اپنے ٹھکانے پر گئے ہوتے تھے۔ انسپکٹر ٹینیسن کو فون پر اطلاع دی گئی کہ ڈینیئل آ گیا ہے۔ ٹینیسن گاڑی لے کر میرے ہاں آ گیا اور مجھے بھی اپنے ساتھ ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔

"مسٹر ڈینیئل!" — اپنے دفتر میں بٹھا کر انسپکٹر ٹینیسن نے اُسے احترام سے کہا — "ہم نے تمہیں پہلے بہت پریشان کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم نے ہمیں معاف نہیں کیا ہو گا لیکن ہم نے ایک موقع پیدا کر لیا ہے کہ تمہارے دل سے اپنے خلاف ناراضگی نکال دیں۔ تم ہمارے لئے بڑی اہم شخصیت ہو۔ ہمیں امید ہے کہ ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے اور ایک اچھے کرسچین کا رول ادا کرو گے۔"

"کیا مجھ پر کوئی نیا الزام عائد ہُوا ہے؟" — ڈینیئل نے مسکراتے ہوئے پوچھا — "اگر ایسا ہے تو پھر بھی میں ایک ذمہ دار شہری اور ایک اچھے کرسچین کا رول ادا کروں گا۔"

"کوئی الزام نہیں" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا اور اُسے ہُوا دیتے ہوئے بولا — "تم کرسچین ہو۔ یہ ہندوستان کی حکومت کا مذہب ہے اور یہ برٹش ایمپائر کا مذہب ہے۔ اس لحاظ سے تمہاری حیثیت بہت اونچی بنتی ہے۔ میں تمہیں ایک اشارہ دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اس ملک میں جاسوس بڑھتے جا رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ ڈینیئل کے چہرے پر ٹینیسن کی ان باتوں سے رونق آ گئی تھی اور اُس کی گردن اس طرح تن گئی تھی جس طرح میں نے کسی انگریز کی گردن بھی تنی ہوئی نہیں دیکھی تھی۔ ڈینیئل دل ہی دل میں انگریزوں کے شاہی خاندان کا فرد بن گیا تھا۔ ٹینیسن نے باتیں کرتے کرتے وجنتی اور عمران کا ذکر چھیڑ دیا۔ پھر اس طرح کی باتیں شروع ہو گئیں جیسے گپ شپ لگائی جاتی ہے۔ میں نے بھی اس گفتگو میں دخل دینا شروع کر دیا

اور ہم ڈینیل کو گفتگو کے اُس مقام پر لے آئے جہاں لانا چاہتے تھے۔

"کیا تم اب بھی وجنتی سے ملتے ملاتے ہو؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"نہیں" — ڈینیل نے جواب دیا — "آخری ملاقات بیس پچیس روز پہلے ہوئی تھی۔"

"تم تو اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے" — میں نے پوچھا — "کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

"گڑبڑ ہی سمجھ لیں" — اُس نے جواب دیا — "میں بات ذرا صاف کر دوں۔ مجھے اس لڑکی پر کچھ شُبہ سا ہو گیا ہے۔ آپ نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اس ملک میں جاسوس بڑھتے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وجنتی بھی اسی چکر میں تو نہیں۔"

"یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"مسٹر ڈینیل!" — میں نے اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا — "ہم نے تمہیں اسی لئے بلایا ہے کہ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرو۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ وجنتی اور اُس کا باپ جے پال سیاسی میدان کے افراد ہیں۔ ہم انہیں مشکوک سے افراد سمجھتے ہیں۔"

"کچھ ایسا ہی شک مجھے بھی ہوتا ہے" — اُس نے کہا — "میں آپ کو اُس کے تعلقات کی تفصیل سُنا دیتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اُس کے ساتھ میری دوستی ہو گئی۔"

"دوستی میں پہل کس نے کی تھی؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"وجنتی نے" — ڈینیل نے جواب دیا — "وہ مجھے ایک ہوٹل میں ملی تھی۔ کسی نے تعارف نہیں کرایا تھا۔ وہ خود ہی میرے پاس آ گئی اور اپنا تعارف کرایا۔ یہ کمزوری تو ہر آدمی میں ہوتی ہے کہ اتنی دلکش لڑکی کی طرف وہ مائل ہو جاتا ہے۔ میں بھی اُس کی طرف مائل ہو گیا اور ہماری دوستی شروع ہو گئی۔ اُس وقت میری شادی ہو چکی تھی۔"

ڈینیل نے وجنتی کی دوستی میں جو دن گزارے تھے اُن کی رُوداد

سنائی۔ اُس نے صاف الفاظ میں بتایا کہ ڈینیل اُس کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا، لیکن وجنتی اُسے سچی محبت کا جھانسہ دے کر دو ہاتھ دُور رکھتی تھی۔ پھر ان کے درمیان شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ ڈینیل کے دل میں ڈیزی کی ناپسندیدگی پیدا ہونے لگی جو ناچاقی تک پہنچ گئی۔ ڈینیل نے بڑے صاف الفاظ میں کہا کہ جو شام وہ وجنتی کے ساتھ گزارتا تھا اسے وہ اپنی زندگی کی بہترین اور رومانی شام سمجھا کرتا تھا۔ اُس شام کے بعد جب وہ گھر آتا تو ڈیزی اُسے ایک بھدی سی لڑکی نظر آتی حالانکہ ڈیزی اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔

"اب مجھے خیال آتا ہے کہ وجنتی میرے ساتھ کوئی اور ہی کھیل کھیل رہی تھی" — ڈینیل نے کہا — "یاد یہ آتا ہے کہ میں اُس کے جسم کے ساتھ لگ کر بیٹھتا تھا اور میں رومانوں کی جنّت میں پہنچ جاتا تھا، لیکن ڈیزی مجھ سے میرے دفتر کی باتیں پوچھتی تھی .... آپ کو معلوم ہے کہ میں جی ایچ کیو میں بڑی اچھی پوسٹ پر ملازم ہوں اور میرا شعبہ بڑا ہی اہم ہے۔ اس شعبے کی اکثر باتیں خفیہ بلکہ ٹاپ سیکرٹ ہوتی ہیں۔ وجنتی مجھ سے یہ باتیں پوچھتی تھی۔ یہی وہ انفارمیشن ہوتی ہے جس کی جاسوس مُنہ مانگی قیمت پیش کیا کرتے ہیں۔ میں نے اُس وقت جذبات کے غلبے کی وجہ سے محسوس نہیں کیا تھا کہ یہ لڑکی مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھتی ہے۔ اب جب میں اُس سے بیزار ہو چکا ہوں اور آپ کی باتیں سُنی ہیں تو مجھے شُبہ ہونے لگا ہے کہ یہ لڑکی جاسوسوں کے کسی رِنگ میں شامل ہے۔ یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مہاتما گاندھی نے انگریزوں کو دھمکی دے رکھی ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی ہونے سے روک دے گا۔ اُدھر جاپانیوں نے انڈین نیشنل آرمی بنالی ہے جس کا کمانڈر سبھاش چندر بوس ہے اور وہ کٹّر کانگرسی ہے۔ اِدھر وجنتی اور اُس کا باپ بھی کانگرسی ہیں۔"

ڈینیل نے بڑی لمبی بات شروع کر دی تھی۔ یہ میں آپ کو آگے

چل کر بتاؤں گا۔ یہاں صرف یہ بتاتا ہوں کہ ڈینئیل نے پوری وضاحت کے ساتھ ہمیں بتایا کہ وجنتی اپنی اس نوجوانی کا طلسم طاری کر کے ڈینئیل سے ہندوستان کے دفاع سے تعلق رکھنے والے اہم راز حاصل کرنے کی کوشش میں تھی۔ ڈینئیل کے بیان سے معلوم ہوا کہ اُس پر دفعہ ۳۰۲ کا مقدمہ بنا تو وجنتی پیچھے ہٹ گئی۔

"میں نے آخری ملاقات میں اُس کے ساتھ تعلق تقریباً توڑ دیا ہے" ——ڈینئیل نے کہا—— "میں نے اُسے کہا کہ اُس کی خاطر میں نے اپنی اتنی اچھی بیوی کو ناراض کیا۔ پھر وہ بے چاری ماری گئی۔ وجنتی کے ساتھ میرے تعلقات کی وجہ سے مجھ پر ہی قتل کا مقدمہ بن گیا۔ گہرائی میں جا کر دیکھا جاتے تو اس کی ذمہ داری وجنتی پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اُس نے میرے ساتھ شادی کا وعدہ کیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ ڈیزی مر جاتے تو راستہ صاف ہو سکتا ہے۔ ڈیزی مر گئی۔ میں نے وجنتی سے کہا کہ اب شادی ہو جانی چاہیئے، لیکن وہ مذہب کا مسئلہ لے بیٹھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ سے جو راز لینا چاہتی ہے وہ اسے نہیں مل سکتا اس لئے یہ لڑکی مجھ سے قطع تعلق کرنا چاہتی ہے۔"

ہم نے ڈینئیل کو یہ نہ بتایا کہ دو چار روز پہلے اُس نے ٹیلیفون پر وجنتی کے ساتھ یہی باتیں کی ہیں اور ہم نے سُن لی ہیں۔ ڈینئیل وجنتی سے فون پر کہہ رہا تھا کہ تمہارا مطالبہ شاید کچھ اور ہے۔ وہ بتا دو، لیکن وجنتی اُسے ٹال رہی تھی۔

اور ہی کھیل کھیل رہی تھی

"مسٹر ڈینئیل!" —— انسپکٹر ٹینیسن نے کہا —— "تم نے ہمیں بڑی ہی قیمتی بات بتائی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ جو شبہ تھا کہ تمہاری بیوی ڈیزی کی دوستی عمران علی کے ساتھ تھی، اس کی صحیح نوعیت کیا تھی؟"

"مجھے ڈیزی کے مرنے کا بہت افسوس ہے" —— ڈینئیل نے کہا —— "وہ خوشگوار لڑکی اور بڑی اچھی بیوی تھی۔ اُس کے قتل کے سلسلے میں آپ لوگوں نے تفتیش کی تھی۔ میں نے اُس تفتیش میں آپ کو بتایا تھا کہ ڈیزی عمران کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی جس کے لئے وہ اپنا مذہب چھوڑنے کے لئے بھی تیار ہو گئی تھی۔ مجھے ڈیزی کے ساتھ شادی کرنے کو چرچ کے پادریوں نے کہا تھا۔ اُدھر عمران کے والدین کو یہ پتہ چلا کہ وہ ایک کرسچن لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑ رہا ہے تو اُس کے بڑوں نے اُس کی شادی ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ کر دی۔ ڈیزی کے دل میں عمران کی محبت تھی پھر بھی اُس نے دل میں میری محبت پیدا کر لی۔ آپ کے لئے یہ بات شاید نئی ہو کہ موت سے تقریباً ایک مہینہ پہلے ڈیزی نے عمران سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ یہ بات ڈیزی نے خود مجھے بتائی تھی۔"

"تم نے یہ بات ہمیں ڈیزی کے قتل کی تفتیش میں تو نہیں بتائی تھی" —— میں نے اُس سے پوچھا —— "تم شاید یہی کہتے رہے تھے کہ ڈیزی عمران سے ملتی ملاتی رہتی تھی۔"

"صرف یہی نہیں" —— ڈینئیل نے کہا —— "میں اب جو باتیں آپ کو بتا رہا ہوں یہ میں اُس وقت بھی بتانا چاہتا تھا، لیکن آپ نے مجھے پہلے روز ہی قتل کا ملزم بنا لیا تھا اور مجھے کچھ اور بتانے کی مہلت ہی نہ دی .... میں کہہ رہا تھا کہ ڈیزی نے عمران سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک روز میں نے اُسے طنزاً کہا کہ عمران شاید کہیں دِلّی سے باہر چلا گیا ہے۔ ڈیزی سمجھ گئی۔ اُس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ اس سلسلے میں ایک بات کرنا چاہتی ہے۔ اُس نے بات یہ کی کہ عمران نے اُس سے اُس کے دفتر کی سیکرٹ معلومات لینے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ڈیزی ایئر ہیڈ کوارٹر میں ایک بڑے اہم ڈائریکٹوریٹ میں سٹینو تھی۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ اُسے ایسی چٹھیاں ڈکٹیٹ کرائی جاتی تھیں جو ٹاپ سیکرٹ

کے زمرے میں آتی تھیں۔ میری طرح ڈیزی بھی دیانتدار تھی۔ اُس نے عمران کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنے دفتر کی کوئی بات نہیں بتاتے گی کیونکہ اُس نے حلف اُٹھا رکھا ہے .... مرنے تک ڈیزی عمران سے نہیں ملی تھی۔"

مجھے یاد آیا کہ عمران کے نوکر نے ہمیں بتایا تھا کہ ایک رات ڈیزی عمران کے گھر گئی تھی اور کسی بات پر عمران اور ڈیزی کے درمیان ناراضگی پیدا ہو گئی تھی اور ڈیزی غصے کی حالت میں چلی گئی تھی اور اس کے بعد وہ عمران کے گھر نہیں گئی۔

ڈینیل کا بیان خاصا لمبا تھا۔ میں نے اور ٹینیسن نے اُس سے کئی سوال پوچھے تھے۔ اس طرح ہمارا یہ شک پختہ ہو گیا کہ وجنتی ڈینیل سے اور عمران ڈیزی سے فوجی راز حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈینیل کا یہ بیان ہمارے بہت ہی کام آیا۔ ہمارے شکوک پختہ ہو گئے۔

ڈینیل کو ہم دونوں نے دوست بنا لیا اور اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ رات خاصی گزر گئی تھی۔ ہم نے عمران علی کی رپورٹ لینے کے لئے اُس اے ایس آئی کو بلایا جس کے حوالے عمران کو کیا تھا۔ اے ایس آئی نے بتایا کہ عمران علی کچھ بھی نہیں بتا رہا۔ ہم اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

صبح ہم ہیڈ کوارٹر میں آتے اور پہلا کام یہ کیا کہ ایک ہیڈ کانسٹیبل کو وجنتی کے گھر بھیج کر اُسے ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وجنتی اپنے باپ کے ساتھ اپنی کار میں آئی۔ ہمارا ہیڈ کانسٹیبل اُن کے ساتھ تھا۔ وجنتی کا باپ ہمارے پاس آیا اور پوچھا کہ ہم نے اُس کی بیٹی کو کیوں بلایا ہے۔

"لالہ جی مہاراج!" — میں نے اُسے کہا — "آپ کی بیٹی کو ہم نے اُس کرسچن لڑکی کے قتل کے سلسلے میں شاملِ تفتیش کیا گیا اور آپ کو یقین دلایا تھا کہ آپ کی بیٹی ہر لحاظ سے محفوظ رہے گی۔ کیا اُس نے ہمارے

خلاف کوئی شکایت کی تھی؟"

"نہیں انسپکٹر صاحب!" — جے پال نے جواب دیا۔

"اب بھی کوئی شکایت نہیں ہو گی" — میں نے کہا — "آپ چلے جائیں۔ ہم آپ کی بیٹی کو جلدی فارغ کر دیں گے۔"

جے پال چلا گیا۔

"وجنتی!" — جے پال کے جانے کے بعد انسپکٹر ٹینیسن نے وجنتی سے پوچھا — "عمران علی کے ساتھ تمہارے بڑے گہرے مراسم ہیں۔"

"نہیں" — اُس نے پختہ سے لہجے میں جواب دیا — "اُس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔"

"عمران علی کہاں ہے؟" — میں نے اُس سے پوچھا۔

"میں کیا بتا سکتی ہوں!" — اُس نے لاتعلقی کے لہجے میں جواب دیا۔

"تم بہت کچھ بتا سکتی ہو وجنتی!" — میں نے کہا — "جو بات تم آج چھپا رہی ہو، وہ کل بتا دو گی۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ بات آج ہی بتا دو؟"

"جس بات کا مجھے علم ہی نہیں وہ میں کیسے بتا سکتی ہوں؟" — اُس نے کہا۔

یہاں میں اس کہانی کو ذرا روک کر ایک ضروری بات بتانا چاہوں گا۔ ڈینیل نے اپنے بیان یا گفتگو میں انڈین نیشنل آرمی کا نام لیا تھا۔ میں اپنی کہانی میں اس آرمی کا ذکر کر چکا ہوں۔ اب پھر اس کا ذکر کروں گا۔ دوسری جنگِ عظیم کے جو لوگ موجود ہیں اُنہیں یاد ہو گا کہ جاپان کی فوجوں نے بحرالکاہل کے تمام جزیروں پر قبضہ کر کے سنگاپور، ملایا اور آج کے انڈونیشیا کے تمام علاقوں پر قبضہ کر کے برما پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور وہاں سے انگریزوں کی انڈین آرمی کو پسپا کر دیا تھا۔ جاپانیوں نے انڈین آرمی کی پوری پوری پلٹنیں جنگی قیدی بنا لی تھیں۔ اِدھر ہندوستان میں ایک بنگالی سبھاش چندر بوس کانگرس کا لیڈر تھا۔ وہ ہندوستان سے نکل کر کسی طرح جاپانیوں کے پاس چلا گیا اور انہیں بتایا کہ وہ اُن کے لئے

ہندوستان پر قبضہ بڑا آسان بنا دے گا۔

جاپانیوں نے اُس کی پیش کردہ تجاویز کو قبول کر لیا۔ اُن کے پاس انڈین آرمی کے جو جنگی قیدی تھے ان کی ایک فوج بنائی جس کا نام انڈین نیشنل آرمی رکھا گیا۔ یہ آئی این اے کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئی۔ جاپانی اپنے اگلے مورچوں میں لاؤڈ سپیکروں سے انڈین آرمی کو خطاب کر کے ہندوستانی قیدیوں سے کہلواتے تھے کہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا ہے تو اس طرف یعنی جاپان کی فوج کے مورچوں میں آجاؤ۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب انگریزوں نے برما پر جوابی حملہ کیا تھا۔

اس پراپیگنڈے کا یہ اثر ہُوا کہ انڈین آرمی کے فوجی سپاہی، عہدیدار اور افسر اِدھر سے بھاگ کر اُدھر جانے لگے۔ یہ فرار وسیع پیمانے پر نہیں تھا۔ کبھی کبھار کوئی نہ کوئی فوجی بھگوڑا ہو جاتا تھا۔ ہندوستان میں بھی آئی این اے کا پراپیگنڈہ جاری تھا۔ اس کے پیچھے کانگرس کا ہاتھ تھا جو خالصتاً ہندوؤں کی جماعت تھی۔

بہت سے مسلمان بھی اِدھر سے بھگوڑے ہو کر جاپانیوں کے پاس آئی این اے میں شامل ہونے چلے گئے تھے۔ اس انڈین نیشنل آرمی کا پول اس طرح کھلا کہ انگریزوں اور امریکیوں کے جوابی حملے کی تاب نہ لا کر جاپانی فوجیں پسپا ہونے لگیں۔ کچھ مسلمان فوجی افسر جو آئی این اے کے ساتھ تھے، اُدھر سے فرار ہو کر پھر اپنی فوج میں آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ آئی این اے کانگرس کی ایک سکیم ہے۔ اس کے ذریعے ہندو ہندوستان میں جاپان کی مدد سے ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آئی این اے میں کانگرس نے مسلمانوں اور سکھوں کو بھی یہ جھانسہ دے کر شامل کر رکھا تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرائیں گے اور ہندوستان میں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت ہو گی۔ اُن دنوں مہاتما گاندھی کا یہ پراپیگنڈہ زوروں پر تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے لوگ ہندو، مسلمان

اور سکھ بعد میں ہیں، پہلے سب ہندوستانی ہیں۔ ہندوؤں کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان اپنے مذہب کو پیچھے رکھ کر سب سے پہلے اپنے آپ کو ہندوستانی کہلائیں لیکن مسلمان اُن کی ان باتوں میں نہیں آتے تھے۔

قومیت اور وطنیت ایک الگ موضوع ہے۔ ایک تھانیدار اتنا عالم فاضل نہیں ہو سکتا کہ وہ اس موضوع پر اتنا لمبا چوڑا مضمون لکھ سکے۔ میں اس کہانی کو مضمون کی شکل دے کر آپ کو بور بھی نہیں کرنا چاہتا۔ مختصر بات یہ ہے کہ ہندوؤں نے جاپانیوں کے ساتھ مل کر جو انڈین نیشنل آرمی بنائی تھی یہ کانگرس کی ایک چال تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی فوج کو جاپانی فوج کے ساتھ ملا کر ہندوستان پر حملہ کرایا جاتے اور ہندوستان سے انگریزوں کو بھگا کر ہندوستان میں ہندو راج قائم کیا جاتے۔ اُن دنوں ہندوؤں کو ایسی چال چلنے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی تھی کہ تین سال پہلے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے روز مسلمانوں نے قراردادِ پاکستان پاس کی تھی۔ ۱۹۴۳ء تک مسلمان قائدِ اعظمؒ کی قیادت میں ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے اور مطالبۂ پاکستان مسلمانوں کا جزوِ ایمان بن گیا تھا۔ انہی دنوں قائدِ اعظمؒ نے ایک جلسۂ عام میں قوم کو یہ نعرہ دیا تھا

PAKISTAN OR PERISH (پاکستان یا موت)۔

میں بھی آخر مسلمان تھا۔ ہندوؤں کو میں بھی اپنا دشمن سمجھتا تھا اور مطالبۂ پاکستان میرا بھی جزوِ ایمان تھا اس لئے میں۔ لے انڈین نیشنل آرمی کے متعلق بڑی دلچسپی سے معلومات فراہم کی تھیں۔ دو تین بھگوڑے فوجی میرے ہاتھ میں بھی آتے تھے۔ وہ ہندوستان کی فوج سے بھاگ کر برما میں جاپانیوں کے پاس چلے گئے اور انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے۔ وہاں جب انہوں نے اصل صورتِ حال دیکھی تو اُدھر سے بھاگ کر اِدھر آ گئے۔

انہوں نے بتایا کہ انڈین آرمی کے تین چار کیپٹن جاپانیوں کے پاس آئی این اے کے جرنیل بنے ہوتے ہیں اور انہوں نے ہندوستان

کو آپس میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ تین چار کیپٹن ہندوستان کے خود ساختہ بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ اُن کا انجام یہ ہُوا کہ انگریزوں اور امریکیوں کے جوابی حملے سے جاپانی بُری طرح پسپا ہُوئے پھر انہیں شکست ہوئی اور ایٹم بم نے جاپان سے ہتھیار ڈلوا لئے۔ آئی این اے کے یہ تین چار کیپٹن (شاہ نواز، ڈھلوں، وغیرہ) پکڑے گئے۔ دِلّی لال قلعے میں ان کا کورٹ مارشل ہُوا۔ ان کا وکیل صفائی پنڈت جواہر لعل نہرو تھا جو بعد میں ہندوستان کا پہلا وزیرِ اعظم بنا تھا۔ اس کے بعد تو آئی این اے پوری طرح بے نقاب ہو گئی تھی۔

حسینہ مان جائے گی

میں نے یہ سیاسی پسِ منظر اس لئے بیان کیا ہے کہ قارئین کو پتہ چلے کہ یہ کیس اصل میں کیا تھا۔ یہ صرف جاسوسی کا کیس نہیں تھا بلکہ وجنتی اور اُس کا باپ آئی این اے کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے اور ان کی سرگرمیاں مسلمانوں کے لئے تباہ کُن تھیں۔ اس لحاظ سے میں مسلمان کی حیثیت سے اس کیس کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے ملزم میرے دشمن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وجنتی ہمارے سامنے آتی تو میرے تن بدن کو آگ لگ گئی۔ میں انسپکٹر ٹینیسن کو موقع ہی نہیں دے رہا تھا کہ وہ بھی وجنتی سے کچھ پوچھے۔ میں اُس سے پوچھ رہا تھا کہ عمران علی کہاں ہے۔ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اُسے دھمکی دی تھی کہ جو بات اُس نے کل بتا دینی ہے وہ شرافت سے آج ہی بتا دے۔ اس دھمکی کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔

"ایل ڈی سوز کون ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"میں کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتی" — اُس نے جواب دیا اور پوچھا — "کون ہے یہ آدمی؟"

"یہ وہ آدمی ہے جو اُس رات کلکتہ سے پنجاب میل پر دِلّی آیا ہے اور اُسے سٹیشن سے لانے کے لئے تمہاری گاڑی گئی تھی۔"

"ہاں!" — اُس نے ذرا سوچ کر جواب دیا — "مجھے یاد آگیا۔ ہماری گاڑی پتا جی کا ایک دوست مانگ کر لے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ اُس کا کوئی عزیز کہیں سے آرہا ہے اور اُسے سٹیشن سے لانا ہے۔"

اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی جسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ سی آئی اے کے پاس شاملِ تفتیش ہو کر بھی مسکرا رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ بھی تھی کہ وہ بہت بڑا جھوٹ بول رہی تھی اور اُس کے چہرے پر ذرا سا بھی خوف نہیں تھا۔ میں نے انسپکٹر ٹینیسن کو دیکھا۔ وہ ایسے انہماک سے وجنتی کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ بھول گیا ہو کہ وہ سی آئی اے کا انسپکٹر ہے اور وجنتی زیرِ تفتیش ملزم ہے۔ یہ صحیح تھا کہ وجنتی خطرناک طور پر خوبصورت تھی لیکن ایک انگریز پولیس انسپکٹر کا اس میں اتنا زیادہ کھو جانا میرے لئے حیرت انگیز تھا۔

انسپکٹر ٹینیسن نے ایک روز میرے ساتھ وجنتی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی کہے تھے کہ اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُسے وجنتی سے محبت ہو گئی ہو۔ میں نے اُسے اتنا سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا تھا، پھر بھی میں یہ سمجھتا تھا کہ ٹینیسن وجنتی کی آبروریزی کرے گا اور اسے وہ ایذا رسانی یعنی تھرڈ ڈگری کے زمرے میں شامل کر دے گا۔ اس سے مجھے یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ تفتیش خراب ہو جائے گی۔ میں اپنے جذبات بیان کر چکا ہوں جو مختصراً یوں تھے کہ میں اس ہندو لڑکی کو اور اس کے باپ کو اپنی قوم کا اور اپنا ذاتی دشمن سمجھ رہا تھا۔

وجنتی نے ایل ڈی سوز سے لاتعلقی اور لاعلمی ظاہر کی تو میں نے اُس سے پوچھنا شروع کر دیا کہ اُس رات کو وہ کہاں کہاں گئی تھی۔

وہ کوئی ایک بھی بات تسلیم نہیں کر رہی تھی۔ انسپکٹر ٹینیسن اُٹھا اور مجھے باہر لے گیا۔ اس تفتیش کے سلسلے میں اُس نے مجھے ایک کام

بتایا اور کہنے لگا کہ میں گاڑی لے لوں اور ابھی چلا جاؤں۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ وجنتی سے میں خود تفتیش کروں گا اور اسے ایک خوبصورت لڑکی نہیں بلکہ عمران علی جیسا ڈھیٹ مرد سمجھ کر اسے ٹارچر سیل میں ڈال دوں گا لیکن ٹینیسن کا حکم ماننا میرے لئے فرض تھا کیونکہ وہ مجھ سے سینئر انسپکٹر تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ انگریز تھا۔ میں بادلِ نخواستہ اُس کے بتائے ہوئے کام پر روانہ ہو گیا۔

یہ کام اس نوعیت کا تھا کہ میں اگلی صبح اپنے ہیڈ کوارٹر میں گیا تو انسپکٹر ٹینیسن کو رپورٹ دی کہ میں کیا کر آیا ہوں پھر اُس سے پوچھا کہ وجنتی کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔

"مان جائے گی" ——— اُس نے کہا ——— "ابھی وہ اپنی جوانی کے جوش میں ہے اور اُسے غالباً یہ توقع ہے کہ اُس کا باپ اُسے چھڑا لے گا .... جن آدمیوں کو ہم نے باہر مقرر کر رکھا ہے، اُن کی رپورٹیں بڑی اچھی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ہم پورے رِنگ کو جلدی زمین کے اُوپر لا کر انٹیلی جنس کے حوالے کر دیں گے۔"

وجنتی ہمارے ہیڈ کوارٹر میں ہی تھی۔ میں نے ٹینیسن سے کہا کہ وجنتی کو بلاتے ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اس لڑکی کو آرام کا سانس نہ لینے دیا جائے اور اُسے سوچنے کا موقع بھی نہ ملے۔

وجنتی کو لایا گیا۔ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ وجنتی کے چہرے پر گھبراہٹ کے کوئی آثار نہیں تھے اور وہ تر و تازہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے گزشتہ روز کی طرح اُس پر سوالوں کے تیر برسانے شروع کر دیے۔ وہ کوئی ایک بات بھی نہیں مان رہی تھی۔

"انسپکٹر ٹینیسن!" ——— میں نے کہا ——— "اسے عمران علی کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ یہ ایسے نہیں مانے گی۔"

"میں اسے زیادہ مہلت نہیں دوں گا" ——— ٹینیسن نے کہا ——— "اسے ذرا میرے پاس رہنے دو۔"

اُس نے وجنتی کو اُس کمرے میں ایک کانسٹیبل کی نگرانی میں بھجوا دیا جس میں اُسے اکیلا رکھا جاتا تھا۔ میرے ساتھ ٹینیسن نے اُس تمام تفتیش کا تجزیہ شروع کر دیا جو اُس وقت تک ہم کر چکے تھے۔ میں نے خود محسوس کیا کہ یہ تجزیہ اور اس پر بات چیت ضروری تھی کیونکہ اب اس واردات کے مرکزی کردار ہمارے ہاتھ میں تھے اور ان کے گروہ کے تین چار افراد دِلی میں تھے جو ہماری نظر میں آ گئے تھے۔

اس بحث و تمحیص میں کم و بیش دو گھنٹے گزر گئے اور ہم نے اس سے آگے بڑھنے کی ایک لائن تیار کر لی۔ انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے کہا کہ میں عمران علی سے الگ تھلگ تفتیش کروں اور وہ وجنتی سے پوچھ گچھ کرتا رہے گا اور ہر شام یا کسی بھی وقت ہم دونوں اپنی اپنی تفتیش ایک دوسرے کو دکھا کر کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔

"انسپکٹر ٹینیسن!" ——— میں نے اپنے اُسی خیال کا اظہار کیا جو میں پہلے بھی کر چکا تھا۔ میں نے کہا ——— "ہم بلاوجہ سر کھپا رہے ہیں۔ اب یہ کیس انٹیلی جنس کا ہے۔ کیوں نہ ہم ڈی ایس پی میڈیوز کو قائل کر کے وجنتی وغیرہ کو انٹیلی جنس کے حوالے کر دیں اور ہم صرف ایکسیڈنٹ کا کیس تیار کر کے چالان عدالت میں دے دیں۔"

"تم نہیں سمجھتے مسٹر ملک!" ——— ٹینیسن نے کہا ——— "میں انٹیلی جنس والوں کو جانتا ہوں۔ وہ ہمارے اوپر والے افسروں کو یہ تاثر دیں گے کہ ہم نے کچھ بھی نہیں کیا اور یہ کیس انہوں نے اپنی محنت سے پکڑا ہے .... دراصل مسٹر ملک! میں تمہارے فائدے کی بات سوچ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کیس مکمل کر کے ہم انٹیلی جنس والوں کو دیں اور میں اس کے ساتھ یہ بھی لکھوں کہ اس ہندوستانی سب انسپکٹر یعنی تم نے بڑی محنت اور دیانتداری سے اس کیس کے ہر فرد کو پکڑا اور بڑی کامیاب تفتیش کی ہے۔ اس سے یہ ہو گا کہ تمہیں ترقی مل جائے گی۔ سند بھی مل جائے گی۔ ہو سکتا ہے کوئی نقد انعام بھی مل جائے، لیکن میں تمہیں انسپکٹر

دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مَیں خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد میں عمران علی سے الگ تفتیش کرنے لگا۔ اس شخص کی حالت بہت ہی بُری ہو گئی تھی، لیکن ابھی تک وہ اپنے انکار پر قائم تھا۔ وہ بار بار سگرٹ مانگتا تھا اور میں اُسے کہتا تھا کہ وہ ہمارے سوالوں کے صحیح جواب دے دے تو میں اُس کے آگے اُن سگرٹوں کے ڈھیر لگا دوں گا جو برانڈ وہ پینے کا عادی ہے، لیکن وہ میری بات پر نہیں آ رہا تھا۔ میں اُسے ایک لالچ یہ بھی دینا چاہتا تھا کہ اُسے وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا، لیکن یہ میں نے پھر کسی وقت کے لئے ملتوی کر دیا۔

میں نے ایک طریقہ یہ بھی سوچا تھا کہ اُسے شراب پلاؤں گا اور نشے کی حالت میں یہ کچھ نہ کچھ اُگل دے گا۔ ہم نے بعض ملزموں پر یہ طریقہ آزمایا تھا۔ اُس روز اُسے اتنا ٹارچر کیا گیا تھا کہ اُس پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ میں اُسے اے ایس آئی کے حوالے کر کے آ گیا۔ اے ایس آئی سے یہ کہہ آیا کہ وہ عمران علی کو کچھ پلا کر ذرا آرام دے۔

ملزمہ غائب ہو گئی

اُسی رات کا ذکر ہے۔ میں گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ گاڑی کے ہارن پر میری آنکھ کھلی۔ اس کے بعد دروازے پر دستک ہوتی۔ میں اپنی گاڑی کا ہارن پہچانتا تھا۔ میں باہر نکلا تو انسپکٹر ٹینیسن کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"مسٹر ملک!" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے بڑی گھبراہٹ میں کہا ـــــ "وہ غائب ہو گئی ہے۔"

"کون؟"

"وجنتی" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

ٹینیسن کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر کا ایک ہندو ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

ٹینیسن نے بتایا کہ اس ہیڈ کانسٹیبل نے آ کر اُسے بنگلے میں اطلاع دی ہے کہ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے۔

میں بڑی تیزی سے کپڑے پہن کر اُس کے ساتھ چلا گیا۔ ٹینیسن نے راستے میں مجھے کہا کہ ڈی ایس پی میڈیوز کو ابھی نہ بتایا جائے۔ میں نے اُس کی اس بات کو ٹھیک نہ سمجھا۔ میں نے کہا کہ اوپر اطلاع دینا بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی عام قسم کا ملزم ہوتا اور جُرم معمولی ہوتا تو پھر ہم ایک دو روز اپنے طور پر تلاش کرتے اور رپورٹ بعد میں اوپر پہنچاتے، لیکن وجنتی کا معاملہ بہت سنگین تھا۔ وہ صرف سی آئی اے کی نہیں بلکہ انٹیلی جنس کی بھی ملزمہ تھی۔

انسپکٹر ٹینیسن میری تجویز رَد کر رہا تھا، لیکن میرے دماغ میں ایک اور خطرہ آ گیا۔ وہ یہ کہ یہ تو انگریز ہے اور اُوپر والے افسر بھی انگریز ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دے۔ میں نے ٹینیسن پر زور دیا کہ ہماری سب سے پہلی کارروائی یہ ہونی چاہیئے کہ ڈی ایس پی کو اطلاع دی جائے۔

"میں کہتا ہوں کہ ابھی اُوپر رپورٹ نہیں دیں گے" ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے ایک حکم کے لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر ٹینیسن!" ـــــ میں نے اُسی کے لہجے میں کہا ـــــ "میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہوں۔ اگر تم رپورٹ دینے سے ڈرتے ہو تو میں رپورٹ دوں گا۔ اگر تمہیں یہ توقع ہے کہ صبح تک لڑکی مل جائے گی یا وہ خود ہی واپس آ جائے گی تو یہ ایسی خوش فہمی ہے جس میں تم جیسے تجربہ کار پولیس آفیسر کو مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔"

ٹینیسن نے مجھ پر اپنا حکم چلانے کی بہت کوشش کی، لیکن میں نے اُس کا یہ غلط حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے اُسے یہاں تک کہا کہ میں وجنتی کے گھر پر اور اُس کے گروہ کے جن آدمیوں کے گھر

دیکھے ہیں، اُن پر چھاپے مرواؤں گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اس سے پہلے میں اُس کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل کو اُلٹا لٹکا کر تفتیش کروں گا کہ لڑکی فرار کس طرح ہوئی۔

مختصر یہ کہ میں نے ایسا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ ٹینیسن چُپ ہو گیا۔ میں نے جب اُسے یہ کہا کہ ایک انگریز افسر کو اتنے بڑے جرم پر زیادہ سوچنا ہی نہیں چاہیئے بلکہ فوری طور پر ایسی کارروائی کرنی چاہیئے کہ سارا ہندوستان ہل جائے تو ٹینیسن نے کہہ دیا کہ تم ڈی ایس پی کو فون کرو۔

رات ڈیڑھ بجے کسی انگریز افسر کو گہری نیند سے جگانے کی جرأت ہندوستان کا کوئی بڑے سے بڑا مہاراجہ اور نواب بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن انگریز افسر اپنی ڈیوٹی کے اتنے دیانتدار تھے کہ اس قسم کی ہنگامی صورتِ حال میں انہیں اُن کا نوکر بھی جگا سکتا تھا۔ میں نے ڈی ایس پی میڈیوز کا نمبر ڈائل کیا تو مجھے آج تک یاد ہے کہ دوسری ہی رِنگ پر اُس کی بیوی نے ریسیور اُٹھا لیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میڈیوز صاحب کے لئے ضروری پیغام ہے تو فوراً ریسیور میڈیوز کے مُنہ کے ساتھ لگ گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ جے پال کی بیٹی وجنتی ہیڈ کوارٹر سے فرار ہو گئی ہے۔

"یہ غلط ہے" ـــــ ڈی ایس پی میڈیوز نے کہا ـــــ "وہ فرار نہیں ہُوئی، اُسے فرار کرایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا گروہ بڑا طاقتور اور پولیس کے اندر تک پہنچنے والا ہے۔ اس گروہ کے ذرائع مضبوط ہیں .... تمہیں کس طرح اور کس وقت پتہ چلا ہے؟"

میں نے اُسے اس سوال کا تفصیلی جواب دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کہے گا کہ فون انسپکٹر ٹینیسن کو دو، لیکن اُس نے یہ کہا کہ فوراً گاڑی بھیجو۔ میں ابھی آ رہا ہُوں۔

میں نے ڈرائیور کو بلایا اور اُسے کہا کہ گاڑی فوراً ڈی ایس پی میڈیوز کے بنگلے پر لے جاتے۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر ڈی ایس پی میڈیوز ہیڈ کوارٹر میں آ گیا۔

اُس کے آنے تک انسپکٹر ٹینیسن نے میرے ساتھ کوئی خاص بات نہ کی۔ میں پریشانی کے عالم میں اُس کے ساتھ کوئی بات کرتا تھا تو وہ اس طرح مختصر بلکہ ادھورا سا جواب دیتا تھا جیسے اُس کا دماغ حاضر نہ ہو۔ اُس کی ذہنی حالت ایسی ہی ہونی چاہیئے تھی۔ ہماری سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وجنتی کو حوالات میں بند کرنے کی بجائے ایک کھلے کمرے میں رکھا جاتا تھا جس کے دروازے پر ایک کانسٹیبل موجود رہتا تھا۔ اس پہرے کی ذمہ داری اُس ہندو ہیڈ کانسٹیبل کی تھی جو ٹینیسن کو یہ اطلاع دینے گیا تھا کہ لڑکی غائب ہو گئی ہے۔

"وہ کہاں سے فرار ہوئی ہے؟" ـــــ ڈی ایس پی میڈیوز نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا ـــــ "مجھے دکھاؤ۔"

میں نے ٹینیسن کی طرف دیکھا۔ اس سوال کا جواب وہی دے سکتا تھا کیونکہ وجنتی کو اُس نے اپنی تحویل میں رکھا ہُوا تھا اور میں عمران علی کے ساتھ لگا ہُوا تھا۔ ٹینیسن آگے آگے چل پڑا۔ ڈی ایس پی اور میں اُس کے پیچھے پیچھے گئے۔ ٹینیسن ایک کمرے کے سامنے رُکا اور بتایا کہ اُسے اس کمرے میں رکھا گیا تھا۔

یہ ہیڈ کوارٹر کی عمارت کا کاریڈور تھا جس کے آمنے سامنے تین تین کمرے تھے۔ یہ کمرے ملزموں، مشتبہوں یا گواہوں کو کچھ دیر بٹھانے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ جس کمرے میں وجنتی کو رکھا گیا تھا اس میں ایک چارپائی اور بستر تھا۔ دو کُرسیاں اور معمولی سی ایک تپائی بھی پڑی ہوئی تھی۔ دروازے میں ایک سٹول رکھا تھا جس پر ڈیوٹی کانسٹیبل بیٹھا رہتا تھا۔ ڈی ایس پی نے اُس کانسٹیبل کو بلایا جو لڑکی کے فرار کے وقت ڈیوٹی پر تھا۔

"کیا تم اُس وقت سوئے ہوئے تھے جب لڑکی یہاں سے نکلی تھی؟" ـــــ ڈی ایس پی نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

"میں پیشاب کرنے چلا گیا تھا صاحب بہادر!" ـــــ کانسٹیبل نے

جواب دیا ـــــ "دروازہ باہر سے بند کر گیا تھا۔ واپس آیا تو دروازہ کھلا ہُوا تھا اور لڑکی کمرے میں نہیں تھی۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" ـــــ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"میں نے ہیڈ کانسٹیبل جیپال کو جگا کر بتایا کہ لڑکی کمرے سے غائب ہے" ـــــ کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"جیپال نے کیا کہا؟"

"جیپال نے کہا کہ وہ انسپکٹر ٹینیسن صاحب بہادر کو اطلاع دینے جا رہا ہے" ـــــ کانسٹیبل نے جواب دیا ـــــ "اُس نے ڈرائیور کو جگایا اور گاڑی میں انسپکٹر ٹینیسن صاحب بہادر کو اطلاع دینے چلا گیا۔"

ڈی ایس پی میڈیوز نے اُسے کہا کہ وہ اُسے وہ بیت الخلا دکھائے جہاں وہ پیشاب کرنے گیا تھا۔ کانسٹیبل اُس طرف چل پڑا۔ ہم سب اُس کے پیچھے گئے۔ پیشاب کے لئے اسی کاریڈور کے باہر ایک بیت الخلا تھا۔ وہاں تک جانے، پیشاب کرنے اور واپس آنے میں دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیئے تھا۔ دس منٹوں میں کسی کا آنا، کمرے کے دروازے کا بولٹ کھولنا اور وجنتی کو جگا کر وہاں سے نکال لے جانا بہت ہی مشکل تھا۔ بیت الخلا میں کانسٹیبل دو یا زیادہ سے زیادہ تین منٹ رہا ہوگا۔ وہ باقی وقت کاریڈور میں جا رہا تھا یا واپس آ رہا تھا۔

کانسٹیبل کو الگ کھڑا کر کے ڈی ایس پی نے ہیڈ کانسٹیبل جیپال سے پوچھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ لڑکی غائب ہے تو اُس نے کیا کہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ انسپکٹر ٹینیسن کو اطلاع دینے چلا گیا تھا۔

"انسپکٹر ٹینیسن کو اطلاع دینے کیوں چلے گئے تھے؟" ـــــ ڈی ایس پی نے پوچھا ـــــ "کیا ہیڈ کوارٹر میں کوئی اور افسر نہیں تھا؟"

معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اُس رات ہیڈ کوارٹر میں دو ہندوستانی انسپکٹر اور ایک سب انسپکٹر ڈیوٹی پر موجود تھے۔ کسی بھی ملزم یا مشتبہ کے فرار کی اطلاع ایک انسپکٹر کو ملنی چاہیئے تھی جو ایسے ہی ایمرجنسی کاموں

کے لئے ڈیوٹی پر تھا۔

"کیا تمہیں انسپکٹر ٹینیسن نے پہلے بتا رکھا تھا کہ یہ لڑکی فرار ہو جائے تو اُسے اطلاع دی جائے؟" ـــــ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

جیپال پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔

ڈی ایس پی نے کانسٹیبل کو بلایا۔

"تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ لڑکی کو غائب دیکھ کر دوڑ کر باہر جاتے؟" ـــــ ڈی ایس پی نے کہا ـــــ "باہر سڑک پر دیکھتے۔ بلڈنگ کے چاروں طرف دیکھتے۔ باہر ایک کار نظر آ جاتی۔ شاید تانگہ نظر آ جاتا اور ہو سکتا تھا لڑکی بھاگتی نظر آ جاتی۔"

سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کی بلڈنگ کوئی قلعہ نہ تھا۔ اردگرد پانچ فٹ کے قریب فصیل تھی۔ ایک گیٹ سامنے کی طرف اور چھوٹا سا ایک گیٹ پیچھے کی طرف تھا۔ سامنے وسیع کمپاؤنڈ تھا۔ پیچھے بھی کچھ جگہ خالی تھی۔ چھوٹی سی ایک سڑک پیچھے سے گزرتی تھی۔ سامنے بڑی سڑک تھی۔

میرے اندر غلامی بیدار ہو گئی

کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل کے بیان اتنے کچے تھے کہ اوسط درجہ ذہانت کا آدمی بھی سمجھ سکتا تھا کہ یہ دونوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ بیان لینے والا ایک انگریز ڈی ایس پی تھا جو سکاٹ لینڈ یارڈ کا تربیت یافتہ تھا اور ہندوستان میں چھ سال گزار چکا تھا۔ ہندوستانیوں کی ذہنیت کو ہم سے زیادہ سمجھتا تھا۔ میں تو فوراً سمجھ گیا تھا کہ لڑکی کو بھگانے میں اس ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل کا ہاتھ ہے۔ یہ دونوں ہندو تھے اس لئے میرا شبہ یہ تھا کہ وجنتی کے باپ نے ان دونوں کو پیسے دے کر وجنتی کو فرار کرایا ہے۔

میں نے دیکھا کہ ڈی ایس پی میڈیوز انسپکٹر ٹینیسن کے ساتھ کوئی

بات نہیں کرتا تھا۔ وہ کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھ گچھ کرتے بار بار میری طرف دیکھتا اور مُسکراتا تھا۔ آخر اُس نے ٹینیسن کو کہا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کے بیٹھے۔ کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل کو وہ میرے کمرے میں لے گیا۔ میں ان کے پیچھے گیا تو اُس نے مجھے کمرے کے باہر کھڑا رہنے کو کہا۔ اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں بہت پریشان ہُوا۔ میڈیوز سخت طبیعت کا ڈی ایس پی تھا۔ اس کے علاوہ واردات اتنی سنگین ہو گئی کہ میری اور ٹینیسن کی اب خیر نہیں تھی۔ ہمیں صرف لائن حاضر ہی نہیں ہونا تھا بلکہ معطل ہونا تھا اور اس کے بعد یہی نظر آتا تھا کہ ہمارے خلاف محکمانہ کارروائی نہیں ہو گی بلکہ مقدمہ چلے گا۔ میں نے اپنی سب انسپکٹری کو دل ہی دل میں خیر باد کہہ دیا اور اپنے آپ کو اے ایس آئی سمجھنے لگا۔ ہمارا (میرا یا انسپکٹر ٹینیسن کا یا دونوں کا) جرم یہ تھا کہ وجنتی کی سیکورٹی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اُسے حوالات میں بند ہونا چاہیئے تھا۔ اس کا جواز موجود تھا۔ اگر اُسے کسی اور کمرے میں رکھنا تھا تو کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل ہونا چاہیئے تھا۔ چابی کسی ذمہ دار افسر کے پاس ہوتی۔

آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ڈی ایس پی نے مجھے اندر بلایا اور کہا کہ ان دونوں کو حوالات میں الگ الگ بند کر کے میرے پاس آؤ۔ میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی اور اُس کے پاس چلا گیا۔

"بیٹھ جاؤ خان!" — اُس نے مجھے بٹھا کر پوچھا — "تم نے کچھ سوچا ہے کہ یہ لڑکی کس طرح فرار ہوئی ہے؟"

"ہاں صاحب!" — میں نے جواب دیا — "اس ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل کو پیسے دے کر وجنتی کے گروہ نے اسے فرار کرایا ہے۔"

"کیا تم بھی ان کے ساتھ تھے؟"

"نہیں صاحب بہادر!" — میں نے جواب دیا — "اگر میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کا وفادار نہیں ہوں تو بھی میں کانگرسی ہندوؤں کا دوست نہیں ہو سکتا کیونکہ میں مسلمان ہوں اور کانگرس کے مسلم کُش مقاصد

کو سمجھتا ہوں۔"

اُس نے مجھ سے اس طرح پوچھ گچھ اور جرح کی جس طرح ہم مشتبہوں سے کیا کرتے تھے۔ میرا دماغ حاضر تھا اور میرے ضمیر پر کسی جُرم کا بوجھ نہیں تھا اس لئے میں ہر سوال کا جواب وضاحت سے دیتا رہا۔ اُس نے مجھ پر ایک گھنٹہ صَرف کر دیا۔

"تم تجربہ کار پولیس آفیسر ہو خان!" — ڈی ایس پی نے مجھ سے پوچھا — "کیا تم نے بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ اس لڑکی کو حوالات میں بند ہونا چاہیئے؟"

"ہاں صاحب!" — میں نے جواب دیا — "مَیں نے صرف سوچا ہی نہیں تھا بلکہ یہ میرا فیصلہ تھا کہ اس لڑکی کو حوالات میں بند ہونا چاہیئے لیکن انسپکٹر ٹینیسن نے میرے خلاف فیصلہ دیا .... ڈی ایس پی صاحب بہادر! اس لڑکی کی گاڑی ایل ڈی سوز کو ریلوے سٹیشن سے لینے کے لئے گئی۔ یہ شخص اُس کے گھر گیا۔ اُسے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ وجنتی اُسے اپنے گھر سے ہوٹل میں لے گئی۔ وہاں سے ایک آدمی کو اُس کے گھر لے گئی پھر ایک آدمی کو ہمارا ہیڈ کانسٹیبل اُس کے گھر تک لے گیا مگر وجنتی نے ہمارے سامنے یہ سب ماننے سے انکار کر دیا۔ میں نے انسپکٹر ٹینیسن سے کہا کہ اسے ہمارے حوالے کرو۔ صاحب! میں اس لڑکی کو تھرڈ ڈگری میں ڈالنا چاہتا تھا مگر انسپکٹر ٹینیسن نہیں مانا۔"

"غور کرو خان! پھر جواب دو" — ڈی ایس پی نے کہا — "میں کہتا ہوں لڑکی کو انسپکٹر ٹینیسن نے فرار کرایا ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟ یہ سوچ لو کہ تم ٹینیسن کے ساتھ تھے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ایک ملزم کی حیثیت سے شاملِ تفتیش کیا گیا تھا۔ مَیں تو پوری دیانتداری سے سروس کر رہا تھا مگر میری دیانتداری مشکوک ہو گئی تھی۔ یہ انگریز ڈی ایس پی ایک انگریز انسپکٹر پر شبہ کر کے مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کیا کہتا ہوں۔ میرے اندر غلامی بیدار ہو گئی۔

"صاحب!" ـــــ میں نے غلاموں کی طرح کہا ـــــ "میں ایک انگریز انسپکٹر کے متعلق رائے نہیں دے سکتا۔"

"میں تم سے دیانتداری کی توقع رکھتا ہوں" ـــــ انگریز ڈی ایس پی نے کہا ـــــ "میں نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ انسپکٹر ٹینیسن نے لڑکی کو یہاں سے نکالا ہے .... بولو، کیا کہتے ہو؟ .... تم اُس کے ساتھ تھے۔"

اچانک میرے ذہن میں بڑے کام کی باتیں آگئیں۔

"صاحب!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں آپ کی حوصلہ افزائی کے باوجود ایک انگریز افسر کے خلاف بات نہیں کروں گا لیکن آپ نے یہ جو کہا ہے کہ میں وجنتی کی تفتیش میں انسپکٹر ٹینیسن کے ساتھ تھا، اس کا پورا جواب دوں گا۔ مجھے اب خیال آیا ہے کہ انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے اُس وقت تفتیش سے کیوں الگ کر دیا تھا جب وجنتی ہمارے پاس آئی تھی۔ وجنتی کے آنے سے پہلے ایک روز انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے کہا تھا کہ اُس کی خواہش ہے کہ اس لڑکی کو شاملِ تفتیش کر کے یہاں بلایا جائے۔ ہم آپس میں باتیں کرتے رہے تو ٹینیسن نے صاف الفاظ میں مجھے کہا کہ وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اُسے اس لڑکی کے ساتھ محبت ہو گئی ہو۔ میں نے انسپکٹر ٹینیسن کو اتنا زیادہ سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میری رائے یہ ہے کہ ٹینیسن وجنتی کو دلی طور پر چاہتا تھا۔ پھر صاحب بہادر! یہ انسپکٹر ٹینیسن ہی تھا جس نے انٹیلی جنس والوں کی میٹنگ میں زور دے کر کہا تھا کہ وجنتی کو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں بلایا جائے ... صاحب! اگر انسپکٹر ٹینیسن کو یہاں بلا لیں تو میں اُس کے سامنے یہ بات کروں گا تاکہ بعد میں ایسا نہ ہو کہ آپ اور انسپکٹر ٹینیسن یہ کہہ دیں کہ میں نے جھوٹ کہا ہے۔"

"نہیں" ـــــ ڈی ایس پی نے افسروں کی طرح کہا ـــــ "تم بات کرو۔"

"بات یہ ہے صاحب!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کہ میں اور ٹینیسن اس تمام تفتیش میں ہر لمحہ اکٹھے رہے ہیں لیکن وجنتی آئی تو انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے باہر کے کاموں پر بھیجنا شروع کر دیا" ـــــ میں نے اسے اُن

کاموں کی تفصیل بتائی جن پر ٹینیسن مجھے بھیجتا رہا تھا۔

"میں جان گیا ہوں" ـــــ ڈی ایس پی نے کہا ـــــ "یہ کام ایک ہیڈ کانسٹیبل کے تھے جو یہ شخص ایک سب انسپکٹر سے کرواتا رہا ہے .... آگے بولو۔"

"پھر انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے کہا کہ میں دوسرے ملزم یعنی عمران علی کے ساتھ لگ جاؤں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "یہ طریقۂ کار بھی غلط تھا۔ میں نے ٹینیسن سے کہا تھا کہ دونوں اکٹھے پہلے کی طرح ہر ملزم سے تفتیش کریں گے، لیکن صاحب! میں ایک انسپکٹر کی اور وہ بھی ایک انگریز انسپکٹر کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔"

"انسپکٹر ٹینیسن انگریز نہیں" ـــــ ڈی ایس پی نے بڑے غصے سے کہا ـــــ "وہ آئرش ہے۔ آئرلینڈ والوں کو ہم آئرش کہتے ہیں .... آگے بات کرو۔"

میں نے اُسے بتایا کہ میں خود محسوس کر رہا تھا کہ انسپکٹر ٹینیسن وجنتی کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے مجھے دُور دُور رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ساری باتیں سن کر ڈی ایس پی کچھ سوچنے لگا اور اُس نے یوں سر ہلایا جیسے وہ میری رائے کا قائل ہو گیا ہو۔

یہاں میں آپ کو برطانیہ کے متعلق ایک بات بتا دوں جو آپ کو شاید پہلے ہی معلوم ہو گی۔ آج کل تو اس کے بہت چرچے ہیں۔ آئرلینڈ برطانیہ کا صوبے جیسا ایک حصہ ہے۔ آئرلینڈ کے لوگ جو آئرش کہلاتے ہیں، انگلینڈ سے آزادی مانگ رہے ہیں۔ یہ ان کی مسلح بغاوت ہے۔ آئرلینڈ والوں نے اپنی باقاعدہ فوج بنا رکھی ہے جسے آئرش ری پبلک آرمی کہتے ہیں اور یہ فوج ساری دنیا میں آئی آر اے کے نام سے مشہور ہے۔ اب تک وہ انگلینڈ میں سینکڑوں جگہوں پر دھماکے کر کے بے انداز انگریزوں کی جانیں لے چکے ہیں جن میں انگریزوں کے شاہی خاندان کا

اور برِصغیر پاک و ہند کا آخری وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن بھی شامل ہے۔

آج کل آئرلینڈ کی جنگِ آزادی عروج پر ہے۔ اس سے پہلے باہر کی دنیا کے عام لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ آئرلینڈ انگلینڈ سے آزادی مانگ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگِ عظیم دوم کے دوران بھی آئرلینڈ کے لوگ انگلینڈ کے لوگوں سے کھچے کھچے رہتے تھے۔ میں نے جب ڈی ایس پی میڈیوز کی زبانی سُنا کہ انسپکٹر ٹینیسن آئرش ہے تو مجھے خیال آیا کہ اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے ورنہ کسی انگریز سے ایسی بددیانتی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انگریز ایک دیانت دار قوم سمجھے جاتے تھے۔

خاوند سے بیوفائی کرتی تھی

مجھے باہر نکال کر میڈیوز نے انسپکٹر ٹینیسن کو اندر بلایا۔ کمرے کا دروازہ پھر بند ہو گیا جو ایک گھنٹے کے بعد کھلا۔ پہلے ڈی ایس پی باہر نکلا۔ اُس کے پیچھے انسپکٹر ٹینیسن تھا۔ ٹینیسن کی آنکھیں ہلکی سبز تھیں لیکن اُس وقت سُرخ تھیں اور ان آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس کا سر جھکا ہُوا تھا۔ ڈی ایس پی نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ باہر جا کر وہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں اور ٹینیسن پیچھے بیٹھے اور گاڑی چل پڑی۔

گاڑی انسپکٹر ٹینیسن کے بنگلے میں جا کر رُکی۔ ٹینیسن نے مجھے اور ڈی ایس پی سے کہا کہ ہم گاڑی میں بیٹھے رہیں۔ اُس نے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھلا۔ برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازے میں وجنتی کھڑی تھی۔ دروازہ اُسی نے کھولا۔ ٹینیسن نے ہمیں اشارہ کیا کہ ہم آجائیں۔ ہم گئے۔

"یہ ہے وجنتی" — ٹینیسن نے کہا۔

ڈی ایس پی نے دونوں کو گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ وجنتی چہرے پر حیرت اور گھبراہٹ کے آثار لئے ٹینیسن کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی چل پڑی۔

سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ کر ڈی ایس پی میڈیوز نے جو کارروائیاں کیں وہ دفتری نوعیت کی تھیں۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ ٹینیسن کو باقاعدہ طور پر گرفتار کر لیا جائے گا، لیکن ڈی ایس پی نے ان تینوں کو لائن حاضر کر دیا۔ وہ تینوں اُسی وقت ہیڈ کوارٹر سے چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ اتنے سنگین جُرم پر اتنی معمولی سی کارروائی کیوں کی گئی ہے۔

اصل راز تو مجھ پر بعد میں کھلا تھا لیکن یہ میں آپ کو کہانی مکمل ہونے سے پہلے ہی سنا دیتا ہوں۔

ہیڈ کانسٹیبل جیپال اور وجنتی پر پہرہ دینے والے کانسٹیبل نے ڈی ایس پی کے سامنے اقبالِ جرم کر لیا تھا کہ انہیں انسپکٹر ٹینیسن نے کہا تھا کہ وہ رات کو وجنتی کو کمرے سے باہر لا کر پچھلے چھوٹے دروازے سے نکالیں۔ تانگے کا انتظام ہیڈ کانسٹیبل جیپال نے کیا تھا۔ تانگہ دُور کھڑا کیا گیا تھا۔ ان دونوں کو ٹینیسن نے ترقی کا لالچ دیا اور کچھ پیسے بھی دیئے تھے۔ میں حیران تھا کہ ٹینیسن جیسا عقلمند، اپنے کام کا ماہر اور تجربہ کار پولیس آفیسر اتنا بھی نہ کر سکا کہ ان دونوں کو قابلِ اعتبار قسم کے بیان سمجھا دیتا اور یہ بھی بتا دیتا کہ ان پر کس قسم کی جرح ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ ان دونوں نے نادان بچوں جیسے بیان دیئے اور کسی بھی سوال کا جواب ایسا نہ دے سکے جو ان کے بیان کو صحیح ثابت کرتا۔ ڈی ایس پی میڈیوز نے انہیں یہ دھمکی دی تھی کہ یہ لڑکی جاسوسی اور تخریب کاری کے جرم کی مجرم نمبر ایک تھی جس کے اغوا میں، انہیں سزائے موت دی جائے گی۔ میڈیوز نے انہیں یہ بھی کہا کہ وہ صحیح بات بتا دیں تو ان کے ساتھ بہت زیادہ رعایت کی جائے گی۔ ایک انگریز ڈی ایس پی کا رُعب ہی کافی تھا۔ اس دھمکی نے ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور انہوں

نے اقبالِ جُرم کر لیا۔

میرے بیان نے انسپکٹر ٹینیسن کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اس کے بعد ڈی ایس پی نے ٹینیسن کو بلایا۔

یہ کیس ختم ہونے کے بعد ٹینیسن نے ایک روز خود مجھے سنایا تھا کہ بند کمرے میں اس کی اور ڈی ایس پی کی کیا باتیں ہوئی تھیں۔ ٹینیسن کی عمر اُس وقت چھتیس سینتیس سال تھی اور وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس کے ساتھ میرا دو سال کا ساتھ تھا۔ ہم نے کئی ایک کیسوں کی تفتیش اکٹھے کی تھی۔ اس طرح ہماری دوستی بھی ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ٹینیسن رُومان پسند آدمی ہے اس کیس کے بعد وہ جب مجھے ملا تو اُس کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ کہنے لگا کہ میں تم سے بہت شرمسار ہوں کہ تمہیں بھی میں نے خطرے میں ڈال دیا تھا۔

اُس نے ڈی ایس پی کو فوراً بتا دیا تھا کہ لڑکی اُس کے بنگلے میں ہے۔ اُس نے ڈی ایس پی کا انداز بھانپ لیا تھا کہ ڈی ایس پی کو پتہ چل گیا ہے کہ لڑکی کو ہیڈ کوارٹر کے ہی کسی آدمی نے نکالا ہے۔ ٹینیسن نے ڈی ایس پی کو جو بیان دیا وہ یہ تھا کہ دس سال پہلے اُس نے ایک لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی لیکن پانچ چھ مہینے بعد ہی اُس پر انکشاف ہُوا کہ لڑکی اُس کے ساتھ بیوفائی کر رہی ہے۔ اُس لڑکی نے کسی اور کے ساتھ تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ ٹینیسن نے کورٹ کے ذریعے اُس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ وہ ایسا دل برداشتہ ہُوا کہ اُس نے پھر شادی کا نام تک نہ لیا۔ اس سے پہلے بھی ٹینیسن کے ساتھ میری گپ شپ رہتی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ شادی جسموں کا نہیں دلوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ اُس نے گزرے ہوئے دس برسوں میں دو تین لڑکیاں دیکھیں۔ ان میں سے ہر لڑکی اُس کی پسند کی تھی، لیکن یہ اُس کا وہم تھا یا کسی طرح اُسے پتہ چل گیا کہ ان میں سے کوئی بھی وفا نہیں کرے گی۔

وجنتی کے متعلق مَیں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ لڑکی ٹینیسن کے دل میں اُتر گئی تھی۔ میں نے خود دیکھا تھا کہ وجنتی کے متعلق وہ اتنا سنجیدہ ہو گیا تھا کہ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اُس نے جب مجھے تفتیش سے الگ کر دیا تھا تو وجنتی کے ساتھ وہ یہی معاملہ طے کرتا رہتا تھا کہ وہ اُسے انڈیا سے نکال دے گا اور اپنے ملک پہنچا کر اُس کے ساتھ شادی کر لے گا۔ وجنتی نقش و نگار کے لحاظ سے تو دلکش تھی ہی، لیکن اُس کا رنگ انگریزوں جیسا تھا۔ میں یہ سُن کر حیران ہُوا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اتنی زیادہ جدوجہد کرنے والی لڑکی برطانیہ جانے اور ٹینیسن کے ساتھ شادی کرنے پر دل و جان سے آمادہ کس طرح ہو گئی۔ بعد میں مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ وجنتی نے اپنے اقبالِ جرم میں بھی کہا تھا کہ وہ برطانیہ جا کر ٹینیسن کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔

"انسپکٹر ٹینیسن!" — میں نے اُس سے پوچھا — "تم نے میڈیوز جیسے سخت ڈی ایس پی کو کس طرح قائل کر لیا تھا کہ وہ اتنی معمولی سی کارروائی کرے۔"

"وہ میرے جذبات سے متاثر ہو گیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "وہ جان گیا تھا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میرے آنسوؤں نے میرے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ میں نے میڈیوز کو یہ بھی کہا تھا کہ مجھے اتنی سی مہلت دے دے کہ میں ریوالور سے خودکشی کر لوں اور وہ یہ ظاہر کرے کہ میں نے گرفتاری سے پہلے ہی خودکشی کر لی تھی۔ دراصل مسٹر ملک! ڈی ایس پی میڈیوز مجھے ذاتی طور پر انگلینڈ سے جانتا ہے۔ اسے پہلے یہ شک تھا کہ میں چونکہ آئرش ہوں، اس لئے میں انگلینڈ والوں کو دھوکہ دے رہا ہوں یا غداری کر رہا ہوں۔ میں نے اُس کا یہ شک رفع کر دیا تھا۔"

انسپکٹر ٹینیسن کو یہ سزا دی گئی تھی کہ چار سال کے لئے اُس کی ترقی روک دی گئی اور اُسے برطانیہ واپس بھیج دیا گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل جیپال اور

اُس کے ساتھی کانسٹیبل کو پولیس سروس سے نکال دیا گیا تھا۔

شراب کے چار پیگ

اب میں کہانی کی طرف آتا ہوں۔ وجنتی کو برآمد کر کے سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں لایا گیا تو اُسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ڈی ایس پی میڈلوز کے کہنے پر اُس نے بیان دے دیا تھا کہ اُسے کس طرح نکالا گیا تھا اور ڈینیئل کے ساتھ اُس نے کس طرح شادی کا معاملہ طے کیا تھا۔

اگلے روز یہ حکم ملا کہ وجنتی کو انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا جائے اور عمران علی کو اپنے پاس رکھ کر ایکسیڈنٹ کا کیس تیار کیا جائے اور اس سے جاسوسی کے جُرم کا بھی اقبال کروانے کی کوشش کی جائے۔ اقبالِ جرم کی صورت میں اس کا بیان مجسٹریٹ سے قلمبند کروا کر عمران علی کو انٹیلی جنس کے حوالے کیا جائے۔ اگر وہ دو تین روز کے اندر اقبالی بیان نہیں دیتا تو اُسے سی آئی اے کے حوالے کر دیا جائے۔

یہ کام میرے سپرد کیا گیا۔ میں عمران علی کے پاس گیا۔ اُسے ایل ڈی سوز کا وہ خط دکھایا جو اس کے نام کلکتہ سے آیا تھا۔ پھر اُسے بتایا کہ اُس کے خلاف کیا کیا شہادت اکٹھی ہو چکی ہے۔ پھر میں نے یہ جھوٹ بولا کہ وجنتی نے اقبالِ جُرم کر کے ہر نشاندہی کر دی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وجنتی کو وہ دیکھے تو پہچان نہ سکے۔ ان دو تین دنوں میں اس لڑکی کے ساتھ جو سلوک ہُوا ہے، اس سے اُس کا حُلیہ ہی بگڑ گیا ہے۔ وہ ایک زندہ لاش بن گئی ہے اور اب اُس نے جرم کا اقبال کیا ہے۔ میں نے یہ بھی جھوٹ بولا کہ وجنتی کے باپ کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ پھر مَیں نے اُسے اُن دو آدمیوں کے نام بتائے اور ایڈریس بھی بتا دیئے جن کو وہ لفافے میں بند پیغام بھیجا کرتا تھا۔

اس شہادت کا تو وہ سامنا ہی نہیں کر سکتا تھا، اُسے اُس کی

جسمانی اور ذہنی حالت نے اقبالِ جرم پر مجبور کر دیا۔ اُس کی سب سے بڑی کمزوری شراب اور سگریٹ تھی۔ اُس کی جسمانی حالت تو ایسی بُری ہو گئی تھی کہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا تو اپنے آپ کو پہچان نہ سکتا۔ اُس کی شیو بڑھ آئی تھی اور چہرہ چُوسے ہوئے آم جیسا ہو گیا تھا۔

"میں صحیح بیان دوں گا" — اُس نے مریضوں جیسی آواز میں کہا — "کسی بھی قسم کی شراب کے دو پیگ اور سگریٹ پلا دیں۔"

مَیں نے چار پیگ شراب اور اُس کی پسند کے برانڈ کے سگریٹ منگوا کر اُس کے سامنے رکھ دیئے۔

"پہلے بیان شروع کرو پھر میں تمہیں شراب اور سگریٹ دوں گا" — میں نے کہا — "جہاں تم نے جھوٹ بولا مجھے پتہ چل جائے گا۔ تمہارے خلاف شہادت مکمل ہے۔"

شراب اور سگریٹ اپنے سامنے دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ چہرے پر رونق آ گئی۔ اُس کی بے چینی اُس کے قابو سے باہر تھی مگر اُس کا نشہ میرے قبضے میں تھا۔ اگر میں اُسے کہتا کہ اس تھوڑی سی شراب اور ایک سگریٹ پیکٹ کے عوض اپنی کوٹھی میرے نام رجسٹری کرا دو تو وہ کرا دیتا۔

اُس نے بیان دینا شروع کر دیا۔ یہ خاصا لمبا بیان تھا۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے میں ضروری حصّے سناتا ہوں۔ وہ جاسوسی کے رِنگ کا آدمی تھا۔ اِس رِنگ کا لیڈر وجنتی کا باپ لالہ جے پال تھا اور وجنتی اِس رِنگ کی بڑی سرگرم اور اہم رُکن تھی۔ اُس نے ڈینیئل کے ساتھ اسی مقصد کے لئے دوستی لگائی تھی کہ اُس سے جی ایچ کیو کے فوجی راز لے گی لیکن ناکام رہی۔

اِدھر عمران علی کی ڈیزی کے ساتھ محبت ہو گئی جو صحیح معنوں میں محبت تھی۔ ان کی شادی نہ ہو سکی۔ میں پہلے تفصیل سے سُنا چکا ہوں۔ ڈیزی کی شادی ڈینیئل کے ساتھ ہو گئی تو عمران علی کو وجنتی نے مشورہ دیا کہ وہ

ڈیزی سے ایئر ہیڈ کوارٹر کے راز لینے کی کوشش کرے۔ عمران علی نے ڈیزی سے بات کی تو ڈیزی بگڑ گئی اور ایک رات ڈیزی اُس سے ناراض ہو گئی۔

عمران علی نے نئی بات یہ بتائی ڈیزی کے قتل سے آٹھ دس روز پہلے عمران علی نے ڈیزی کو فون کیا اور اُسے کہا تھا کہ وہ عمران علی کی بات مان لے ورنہ وہ اُسے بلیک میل کرے گا۔ ڈیزی نے کہا کہ وہ اُسے کیا بلیک میل کرے گا، بلیک میل تو اب وہ خود ہو گا۔ ڈیزی کے پاس کوئی ایسی شہادت آگئی تھی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ عمران علی اور وجنتی کے آپس میں گہرے مراسم ہیں اور یہ مراسم جذباتی نہیں بلکہ جاسوسی کے سلسلے میں ہیں۔ اِس کے علاوہ عمران علی کو ایئر ہیڈ کوارٹر سے کسی کام کا ٹھیکہ ملا تھا جو منسوخ ہو گیا اور کسی اور کنٹریکٹر کو دے دیا گیا تھا۔ عمران علی کو شک تھا کہ ٹھیکہ ڈیزی نے منسوخ کرایا ہے۔

عمران علی نے وجنتی کے ساتھ بات کی تو یہ فیصلہ ہُوا کہ ڈیزی کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اُسے قتل کرنے کی ترکیبیں سوچی جا رہی تھیں کہ ایک روز ڈینئیل نے وجنتی کو بتایا کہ ڈیزی کو ہسپتال داخل کرا دیا گیا ہے۔ اُس وقت تک وجنتی ڈینئیل کے ساتھ محبت کا ناٹک کھیل رہی تھی۔ اُس نے عمران علی کو بتایا۔

عمران علی بڑا چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ اُسے پتہ چلا کہ ڈیزی کو مسلسل گلوکوز لگا ہُوا ہے تو اُس نے ڈسپنسر شعیب کے ساتھ دوستی پیدا کر لی اور اُسے کہا کہ وہ ڈیزی کے گلوکوز میں زہر ملا دے۔ شعیب کو پیسوں کی ضرورت تھی۔ اُس نے پانچ سو روپوں کی پیشکش قبول کر لی لیکن ڈینئیل کی ماں ہسپتال میں ڈیزی کے ساتھ رہتی تھی اس لئے شعیب کو موقع نہیں ملتا تھا۔

ڈیزی بہتر ہونے لگی اور ایک رات ڈینئیل کی ماں اپنے گھر چلی گئی۔ شعیب کو موقع مل گیا اور اُس نے ایک زہریلی دوائی گلوکوز کی

نالی میں انجیکٹ کر دی اور ڈیزی کو ہلاک کر کے پانچ سو روپوں کا حق ادا کر دیا۔ اُس نے ڈیزی کے قتل کی تفتیش میں ہمیں جو بیان دیا تھا وہ اُسے عمران اور وجنتی نے بتایا تھا۔ اس میں شعیب کی اپنی استادی بھی شامل تھی۔ انہوں نے ڈینئیل کو اس بیان میں پکا ملزم بنا دیا تھا۔

وجنتی اور عمران علی نے ہمیں جو بیان دیئے تھے وہ بھی ڈینئیل کے خلاف تھے۔ میرے روکنے کے باوجود انسپکٹر ٹینین نے جلد بازی کی اور انہی کے بیانات پر ڈینئیل کے خلاف مقدمہ تیار کر دیا بلکہ ان سے مزید جھوٹ بلواتے۔ خدا نے انصاف کیا کہ ڈینئیل ہائی کورٹ سے بری ہو گیا اور ڈسپنسر شعیب کو اُسی شخص سے مروایا جس نے اُسے پیسے دے کر ایک بے گناہ عورت کو قتل کرایا تھا۔

ہمارا شک بلکہ یہ یقین تھا کہ عمران علی نے شعیب کو قتل کرنے کے لئے اُسے کار سے ٹکر ماری تھی لیکن عمران علی نے اقبالی بیان میں کہا کہ یہ غلط ہے۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس کے آگے جو سائیکل سوار جا رہا ہے وہ شعیب ہے۔ عمران علی شراب کے نشے میں تھا اور اُس سے گاڑی سنبھالی نہیں جاتی تھی۔

مَیں نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں ٹیلیفون پر عمران علی اور وجنتی کی جو گفتگو سُنی تھی، اس میں انہوں نے شعیب کے قتل کی کوئی بات نہیں کی تھی، حالانکہ انہوں نے بڑی نازک اور انتہائی خفیہ باتیں کی تھیں۔ ان کی گفتگو سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس نے شعیب کو ٹکر ماری ہے۔ یہ تو خدا کی بے آواز لاٹھی چلی تھی۔ قاتل مارا گیا اور عمران علی اور وجنتی قانون کے شکنجے میں آ گئے۔

عمران علی نے اپنے اقبالی بیان میں تفصیل سے بتایا کہ وہ اور وجنتی جے پال کی لیڈر شپ میں آئی این اے کے لئے کام کر رہے تھے اور راز کی باتیں جاپانیوں تک پہنچاتے تھے۔ ان کے گروہ میں کلکتہ کے چند ایک بنگالی بھی تھے اور یہ سارا کام ہندوستان میں ہندو راج قائم

کرنے کے لئے ہو رہا تھا۔

مَیں نے عمران علی کا بیان مجسٹریٹ سے قلمبند کروا کر اُسے جوڈیشل حوالات میں نہ جانے دیا کیونکہ وہ انٹیلی جنس کو مطلوب تھا۔

وجنتی انٹیلی جنس کے پاس تھی۔ اس محکمے نے دو دنوں میں وجنتی کے باپ لالہ جے پال کو اور ان کے رِنگ کے اُن آدمیوں کو جن کی نشاندہی ہم نے کی تھی، گرفتار کر لیا۔ چونکہ ابتدائی تفتیش میں نے کی تھی اس لئے انٹیلی جنس والے وقتاً فوقتاً مجھے بلاتے تھے۔ میں نے ایک روز وجنتی کو دیکھا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُس پر کیسا کیسا تشدّد کیا گیا ہے۔ اُس کے چہرے پر نہ حسن رہا تھا نہ جوانی کی رمق رہی تھی۔ وہ اپنی قدرتی چال چلنے سے بھی معذور ہو گئی تھی۔ اُس سے اقبالِ جرم کروا لیا گیا تھا۔

اِس رِنگ کے بہت سے ممبر پکڑے گئے تھے۔ دو آدمی کلکتہ سے بھی گرفتار ہوئے تھے۔

ایک سال بعد، جاپان کی شکست کے چند مہینے پہلے وجنتی، عمران علی اور لالہ جے پال کو چودہ چودہ سال سزائے قید دی گئی۔ اس رِنگ کے دوسرے آدمیوں کو بھی لمبی سزائیں دی گئی تھیں۔ عمران علی کو دوسری عدالت سے شعیب کو ایکسیڈنٹ میں ہلاک کرنے کے جُرم میں چار سال مزید سزائے قید دی گئی تھی۔

یہ سب خوش قسمت تھے کہ تین سال بعد ہندوستان آزاد ہو گیا۔ میں تو انسپکٹر بن کر پاکستان آ گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد لاہور میں دِلّی کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس کیس سے واقف تھا۔ اُس نے بتایا کہ آزادی ملنے کے فوراً بعد اِن سب کو رہا کر دیا گیا تھا۔ اب وہ مجرم نہیں بلکہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے ہیرو تھے۔ عمران علی اور اُس کا تمام خاندان ہندوستان میں رہ گیا تھا۔ اس خاندان پر ہندوؤں کا اثر تھا اس لئے یہ خاندان وہیں خوش رہ سکتا تھا۔